آتشِ زیرِ پا

بانو قدسیہ

فہرست

۱۔ ذات کا محاسبہ	9
۲۔ خورد سال	۲۲
۳۔ ہزار پایہ	۲۷
۴۔ اقبالِ جرم	۳۴
۵۔ الزام سے الزام تک	۳۹
۶۔ بہوا	۵۹
۷۔ پہلا پتھر	۶۴
۸۔ خود شناس	۸۷
۹۔ چھچھو	۱۰۹
۱۰۔ واماندگیٔ شوق	۱۲۷
۱۱۔ مات	۱۴۹
۱۲۔ حُسنِ خاتمہ	۱۶۵
۱۳۔ توبہ شکن	۱۷۷
۱۴۔ پسپائی	۲۰۴
۱۵۔ پیا نام کا دیا	۲۱۸
۱۶۔ ہوتے ہواتے	۲۳۱

ذات کا محاسبہ

کھلی گٹھڑی کی طرح وہ بکھرا رہتا تھا۔ اس نے کئی راتیں ہمسائے کے چھتنار سے درخت کو کھڑکی میں سے دیکھ کر گزاری تھیں۔ ذی شان کو اس درخت کے پتے ڈالیاں چاندنی راتوں میں خاموش چمک کے ساتھ بہت پُر اسرار وحدت لگتی تھیں۔ وہ سوچتا کہ اتنے سارے پتوں کے باوجود درخت کی اکائی کیسے قائم رہتی ہے۔ اگر یہ پتے ڈالیوں سے علیحدہ ہو جائیں تو ان بکھرے پتوں کو کیسے سمیٹا جا سکتا ہے۔

تب تک اسے معلوم نہیں تھا کہ پتے درخت کے اپنے وجود سے پیدا ہونے والے تھے اور وہ جن خواہشات کی وجہ سے بکھرا تھا وہ سب اس کے بیرون سے آئی تھیں۔

کبھی کبھی کار چلاتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ جس طرح جاپانی خودکشی کرتے ہر اور ہارا کیری کرتے وقت اپنی کوکھری کے ساتھ تمام انتڑیاں اور پیٹ کے عضلات نکال پھینکتے ہیں۔ ایسے ہی اس کے بھی کسی عمل سے اس کا انتڑ پیٹا بکھر گیا اور اب وہ جلد اور پٹھوں کی مضبوط ڈھال نہیں تھی جس میں اس کے بکھرے ہوئے وجود کو منڈھا جاتا۔

اس بات کا ایک بار اسے ہلکا سا خیال ان چھ ماہ کی چھٹیوں میں آیا تھا۔ جب اس نے ایف اے کا امتحان دے کر بی اے کے داخلے سے پہلے اپنے لیے بہت لمبے چوڑے پلان

بناتے تھے۔ صبح سوئمنگ پھر ورزش پھر گٹار کے سبق، شام کو فرنچ کی کلاسیں رائڈنگ وغیرہ تمام دوستوں کے ساتھ فرداً فرداً سچ کا رشتہ ماں باپ کی عزت، بہن بھائیوں سے محبت، رشتہ داروں کا پاس۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایف۔ اے کے امتحانوں سے پہلے اسے نہ دوسروں سے اتنی توقعات تھیں نہ ہی وہ اپنے وجود کو اس قدر گانٹھ کر رکھتا تھا لیکن امتحانوں کے دنوں میں اس نے بڑی محنت کی پرچے اچھے ہوئے اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی ذات کا محاسبہ اور مواخذہ کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ محاسبہ چاہے کسی غیر کا ہو یا اپنا ہو ہمیشہ کڑا ہوتا ہے۔ اس میں چوتی دوتی کی چھوٹ نہیں ملتی۔

اس محاسبے تلے وہ بہت جلد کثیر المقاصد ہوتا چلا گیا لیکن ایف اے پاس تھا اس لیے اُسے علم نہ ہو سکا کہ فوارے کی طرح وہ بہت سے چھیدوں میں سے نکل کر پھوار تو بن سکتا ہے آبشار کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ جب تمام تجارتوں کا گیدڑ بننے کی خاطر اسے اپنا سونا، کھانا پینا، آرام گپ بازی ترک کرنا پڑتی تو اندر عاجز آجانے کا خیال ابھرتا اسے لگتا جیسے وہ کسی مبہم سے عارضے میں مبتلا ہے لیکن اس نے اپنے آپ سے ایسی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں کہ اپنے بنائے ہوئے ضابطے سے باہر نکلنا اس کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

ایک روز وہ الکٹرونک کی ہابی میں مشغول اپنے اردگرد بہت سے سرکٹوں کے کاغذ جیسیں تاریں گتے کا ویا پھیلائے بیٹھا تھا کہ ماموں آگئے۔ ماموں خوش زبان، متوسط طبقے کے کچھ بے فکرے کچھ ذمے دار آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی کائنات اس قدر نہیں پھیلا رکھی تھی کہ اس کے نیچے انہیں خوف آنے لگے۔

"مچھلی کا شکار کھیلنے جا رہے ہیں، چلو گے؟"

"کمال ماموں — میں یہ چھوٹا سا سرکٹ مکمل کر لوں۔"

ماموں آرام سے کرسی میں بیٹھ گئے۔

"ذی شان!"

"جی ماموں۔"

"تم بہت اچھے آدمی ہو۔"

"تھینک یو ماموں۔"

"باوجود کہ تمہارے ابو امی نے تم پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ تم میں ایک اچھے انسان بننے کی تمام خوبیاں اور خرابیاں موجود ہیں۔"

"تھینک یو ماموں۔"

"بات یہ ہے بیٹا ACTIVITY بہت اچھی چیز ہے لیکن کثیر المقاصد انسان اتنا ہی پراگندہ ہو جاتا ہے جس قدر سست الوجود کام سے نفرت کرنے والا پوستی — اپنے آپ کو کہیں دھجیوں میں نہ بانٹ دینا — سالم رہنا — سالم۔"

وہ ماموں کی بات بالکل نہ سمجھتا تھا پھر بھی اس نے سوال کیا۔ "وہ کیسے ماموں آج کی زندگی میں سالم کیسے رہا جا سکتا ہے۔"

"بس خواہشات کا جنگل نہ پالو — آرزو کا ایک پودا ہو تو آدمی منزل تک بھی پہنچتا ہے اور بکھرتا بھی نہیں۔"

ذی شان چونکہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان تھا اور انسان جو بھی سیکھتا ہے یا تو ذاتی لگن سے سیکھتا ہے یا اپنے تجربے کی روشنی میں خوف سے سیکھتا ہے۔ اس لیے تجربے کی کمی کے باعث ذی شان کو ماموں کی باتیں کتابی لگتیں۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ماموں متوسط طبقے کا آدمی تھا۔ اس کی قمیض کے کالر پہ ہلکی سی میل ہوتی۔ ماموں کا رہن سہن معمولی تھا۔ ایسے لوگوں کی باتیں سُنی تو جا سکتی ہیں لیکن اُن کی سچائی پہ عمل نہیں کیا جا سکتا۔

ذی شان کے لیے زندگی ایک دوڑ کی شکل اختیار کرتی گئی۔ ایسی دوڑ جو سیدھی

نہیں تھی۔ کئی راستوں، کئی پگڈنڈیوں، کئی سرنگوں میں سے ہو کر نکلتی تھی۔ اپنی دستار بندی میں وہ اتنا مشغول تھا کہ اسے علم نہ ہو سکا کہ کب اس نے اکنامکس کا ایم۔ اے کر لیا۔ کس وقت وہ اعلیٰ قسم کا ڈی بیٹر بھی ہو گیا۔ اُسے ڈراموں میں بھی ٹرافیاں مل گئیں فوٹوگرافی کے مقابلوں میں بھی اس کی تصویروں کو انعام ملنے لگا۔ کھیلوں میں بھی اس کا نام بولنے لگا۔ مختلف رسالوں میں اس کی غزلیں بھی چھپ چھپا کر قابلِ ذکر کہلانے لگیں۔ دو ایک اخباروں میں خصوصی نمائندہ بنے رہنے کی وجہ سے اس کی جنرل نالج شہری واقعات کے متعلق بہت بھرپور ہو گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ ان چار سالوں میں اس نے تین چار ادھورے پورے عشق بھی کیے۔ ان محبتوں کا اس کی ذات پر گھمبیر اثر نہ ہو سکا کیونکہ جن لڑکیوں سے اس نے محبت کی تھی اُن کے بھی عشق کے علاوہ کئی مشاغل تھے۔ وہ بھی کثیر المقاصد تھیں اور پرانے زمانے کی محبوباؤں کی طرح نہ تو ہار سنگار ہی کو اپنا شعار سمجھتی تھیں نہ ہی اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑی رہتی تھیں — انہیں بھی کالج جانا ہوتا۔ شاپنگ کے لیے وقت نکالنا پڑتا بیوٹی پارلروں سے فیشن کرانے ہوتے۔ سہیلیوں مرجانیوں کا دل رکھنے کو لمبے لمبے فون کرنے ہوتے۔ پھر سوشل لائف تھی۔ کچھ ان کے والدین کی کچھ ان کی اپنی — کچھ خواب تھے شادی کے، کچھ خواب تھے C A R E E R کے — ان لڑکیوں کے ساتھ جو معاشقے ہوئے ان میں زیادہ وقت فون پر گزرا، یا پھر اچھے ہوٹلوں میں جہاں زبان کے لطف کے ساتھ ساتھ اچھی خوشبوؤں، خوبصورت لباسوں کی چمک کے ارد گرد رد شبینوں میں ایک دوسرے کے ٹیسٹ پر اعتراضات کے ساتھ ساتھ لڑائیاں بھی ہوئیں — اچھی پیاری پیاری باتیں بھی کی گئیں — اور آخر میں دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو الوداع بھی کہا گیا۔

یہ نکم سیر قسم کے عشق نہیں تھے جو دُکھ یا سُکھ کی آخری سرحدوں کو چھوا کرتے

ہیں۔ یہ نُورا کشتی سے مشابہ تھے کہ خوب دھپ دھپیا کے بعد اکھاڑے سے برلیف میں پسینے میں شرابور نقلی زخموں سے چُور نکلے اور اپنے اپنے راستے پر یوں چل دیے جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔

ان ہی دنوں جب اس کی شادی کی باتیں کامن ٹاپک تھیں۔ رشتے بھی آ رہے تھے اور افیئر بھی چل رہے تھے، اس کی پھوپھی زاد بہن کا رشتہ بھی آیا۔ پھوپھی عرصے سے بیوہ تھیں۔ وہ اپنے سسرال میں رچ بس گئی تھیں لیکن ذی شان کی لیاقتوں کے شُہرے سن کر وہ بھی امیدوار تھیں کہ ان کی آراد کا کچھ جوڑ توڑ ذی شان سے ہو جائے۔ نام تو پھوپھی زاد کا پتہ نہیں نسرین آرا، یا شمیم آرا، یا جہاں آرا تھا لیکن بلاتے سبھی اُسے آرا تھے۔ ذی شان کو یہ دھان پان سی لڑکی شروع سے ہی لکڑی چیرنے والا آرا ہی لگی۔

آرا بالکل ماڈرن تھی۔ سطحی طور پر دلچسپ اور اندر سے ٹھس سی لڑکی — وہ میک اپ کپڑے، بی اے کی ڈگری، بیوٹی پارلر، وی سی آر پر دیکھی ہوئی فلموں کا ملغوبہ تھی — دو چار ملاقاتوں کے بعد کھُلتا کہ اس کی پسند ناپسند کچھ ذاتی نہ تھی بلکہ فلم ایکٹرسوں، شاعروں ادیبوں اور کرکٹروں کے انٹرویو پڑھ پڑھ کر مرتب کی گئی تھی۔ ایسے ہی اس کے کچھ نظریات تھے جو ہرگز کسی ذاتی کاوش یا تدبر کا نتیجہ نہ تھے بلکہ بڑوں کی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر اخذ کیے گئے تھے — وہ دیکھنے، سننے اور چاہنے میں بڑی جاذب تھی لیکن کچھ ملاقاتوں کے بعد اس روغنی ہانڈی کا اصلی پن ظاہر ہونے لگتا اور لوگ اسے پریشر ککر کے زمانے میں بالکل ویسے ہی بھولتے جیسے وہ روغنی ہانڈی کو بھولتے ہیں۔

ذی شان کو آرا میں واقعی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن کچھ ملاقاتیں دلچسپ رہیں اور پھر بخار ٹوٹ گیا۔ ان ہی دنوں وہ دو چار نوکریوں کے لیے بھی کوشش کر رہا تھا۔ اباجی کی وہ زمین جو داہگے کے قریب تھی اس کی دیکھ بھال بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ پھر وہ لڑکیاں اور بھی تھیں جن کو کبھی کبھی ڈرائیو پہ لے جانا، ہوٹل میں ٹریٹ دینا اس کا

سردرد تھا۔

ان مشاغل کے علاوہ اس کی امی کی صحت بھی گر رہی تھی اور انہیں جملہ ڈاکٹروں کو دکھانا، دوائیاں لانا، ٹیسٹ ایکسرے کرانا، امی کی دلجوئی اور رشتہ دار خواتین کو بیماری کی تفصیلات مہیا کرنا، اس کے مشاغل تھے۔ ان مشاغل کے علاوہ اسے وی سی آر پہ فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ کرکٹ میچ اور ویڈیو فلموں کو دیکھنے کے لیے جب اسے وقت نکالنا پڑتا تو کبھی کبھی بڑی الجھن کا سامنا ہوتا۔

ایسے ہی وقت میں جب وہ وی سی آر پر ایک دھما کے دار مار دھاڑ کی فلم دیکھ رہا تھا اور اس کی امی نے فون پہ اپنی نند کو جواب دے دیا تھا تو آراد ان کے گھر آئی۔ — ذی شان کی تمام تر توجہ اس وقت فلم میں تھی لیکن آراد روئی ہوئی لگتی تھی۔ وہ اس کے پاس آ کر صوفے پہ بیٹھ گئی اور چپ چاپ مار دھاڑ کی فلم دیکھنے لگی۔

ذی شان کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی امی اس رشتے کے لیے انکار کر چکی ہیں۔ اگر اسے معلوم بھی ہوتا تو بھی کچھ اتنی زیادہ حسرت اس کے دل میں جگہ نہ پاتی۔ وہ کبھی کبھی تکلف کے ساتھ آراد کو مسکرا کر دیکھ لیتا اور پھر فلم دیکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ آراد کی حالت اس سے مختلف تھی۔ وہ اندر ہی اندر کچھ جملے بنا سنوار رہی تھی۔ کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔ کچھ بتانے پر آمادہ تھی۔

جب فلم میں وقفے کے بعد چند اشتہار آنے شروع ہو گئے تو ذی شان نے فراخدلی سے پوچھا:

"کیا حال ہیں؟"

"آپ کو معلوم ہوگا کیا حال ہو سکتے ہیں۔"

"کیوں خیر تو ہے بڑی مایوس سی لگتی ہو۔"

آراد کی جانب سے بڑا لمبا خاموشی کا وقفہ آ گیا جس وقفے میں ذی شان نے اپنے

اندر ہی اندر آنے والے چار گھنٹوں کا پروگرام مرتب کیا اور وہ رُوٹ بنایا جس پہ کار لے جانے سے اسے دوہرے تہرے پھیرے پڑنے کا احتمال نہ تھا۔

"مامی جی نے تو انکار کر دیا ہے آج صبح۔"

وہ چند لمحے سمجھ نہ سکا کہ کس لیے کس کو اور کس بات سے مامی جی نے انکار کر دیا ہے۔

"آپ کو تو شاید کچھ فرق نہ پڑے۔"

اب بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی۔

"آراد — دیکھو میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا — یہ بہتر ہے کہ اب میں تمہیں چھوٹا سا زخم دوں بہ نسبت یہ کہ بعد میں تمہیں — ساری عمر تکلیف دیتا رہوں — ابھی میں SETTLE ہونا نہیں چاہتا۔ میں ابھی طے نہیں کر سکا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ کدھر اور کس کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔"

آراد یقیناً ایک ماڈرن لڑکی تھی لیکن ماڈرن لڑکیوں کے بھی کئی گریڈ ہوتے ہیں۔ اور اس کا گریڈ چپراسیوں کا سا تھا جو انکار سن کر زیادہ اصرار نہیں کر سکتے۔ وہ اٹھی — اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ پھر اس نے دو قدم ذی شان کی جانب بڑھائے اور کہا:

"ذی شان — تمہاری ACTIVITIES زیادہ ہیں۔ اتنے مشاغل ہوں تو آدمی بٹا رہتا ہے۔ کبھی کبھی خالی بیٹھ کر اپنے ساتھ بھی وقت گزارا کرو — کافی دھند چھٹ جاتی ہے اور دُور تک نظر آنے لگتا ہے — پھر فیصلے اپنے بھی ہوتے ہیں اور آسان بھی —"

ذی شان نے آراد کی بات پہ کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آراد زیادہ تر باتیں نامور ادیبوں کے اقتباسات یاد کر کے کرتی ہے۔

آراد اس کی زندگی سے نکل گئی۔ غالباً وہ کبھی آئی ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اس کی

شادی ہوگئی اور شادی کے بعد مشاغل میں اور اضافہ ہوگیا۔

اس کی بیوی ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خود ساختہ لاڈلی تھی۔ وہ بھی ایک متمول خاندان کا پڑھا لکھا خوبصورت فرد تھا۔

کبھی سسر کی گاڑی، کبھی باپ کی کار، کبھی اپنی کبھی بیوی عائلہ کی گاڑی میں کئی جگہوں پر جانا پڑتا۔ کہیں کام، کہیں تفریح —— لیکن ملنا جلنا آنا جانا سمٹتا پھیلتا اس قدر تھا کہ فرصت کے لمحات سکڑتے گئے اور وہ اپنے آپ سے کبھی نہ مل سکا۔

ایک بات طے پاگئی کہ پاکستان میں رہ کر خاطر خواہ ترقی نہیں ہوسکتی۔ یہاں وسائل و مواقع کی بڑی کمی ہے۔ یہ نہیں کہ ذی شان کو مالی طور پر کسی ترقی کی ضرورت تھی لیکن زندگی جمود کا نام بھی تو نہیں ہوسکتا۔

پاکستان میں ذی شان اور عائلہ کی زندگی ایک روٹین کا شکار ہوچکی تھی اور اتنے سارے مشاغل کی پیروی نے انہیں چڑچڑی بلی کی طرح ہر کھمبے کو نوچنا سکھا دیا تھا۔

جب بھی انہیں فرصت کا کچھ وقت ملتا وہ ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طور کی شکایت ہی کرتے۔ کبھی تمام الجھنوں کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں ٹریفک ٹھیک نہیں۔ یہاں کا تعلیمی نظام پس ماندہ ہے۔ تمام سسٹم کام نہیں کرتے۔ وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ پھر خاندان والے بے جا مداخلت کرتے ہیں۔ شخصی آزادی کا نام و نشان کہیں نہیں۔ دوست ریاکار منافق ہیں —— اصلی رشتوں کی پہچان گم ہوگئی ہے۔ نقلی رشتے بہت زیادہ ہیں ——؟

دفتروں میں گپ بازی فائل سسٹم بہت زیادہ ہے۔ بیوروکریٹ کی سرداری ہے ماں باپ مشفق کم ہیں، مطالباتی زیادہ ہیں۔ بہن بھائیوں کی اپنی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ وہ اپنے اپنے مدار پہ ہیں۔ غرضیکہ جب ذی شان اور عائلہ کو پاکستان سے اور پاکستان میں بسنے والوں سے اتنی شکایات ہوگئیں کہ انہیں ان شکایات کا کوئی حل نہ مل سکا تو انھوں نے اپنی بیقراری

کا حل صرف یہی سوچا کہ وہ لندن چلے جائیں اور وہاں قسمت آزمائیں۔

لندن جانے سے پہلے ایک روز وہ پھوپھی جان سے ملنے بھی گیا۔ آرام ایک کند قینچی سے گلاب کا پھول کاٹ کر اپنی ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ وہ ذی شان سے ایسے ملی جیسے ان دونوں کے درمیان کبھی کچھ تھا ہی نہیں لیکن جب ذی شان چلنے لگا تو آرام کچھ چپ سی ہوگئی۔

"واپس کب آؤ گے؟"

"بس آتا جاتا رہوں گا۔"

"اچھا؟" آرام نے سوالیہ نظروں کے ساتھ پوچھا۔

"بھئی آتا جاتا رہوں گا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ امی ابو سے ملنے تو آؤں گا ہی۔"

"کبھی کبھی اپنے آپ سے بھی مل لینا ذی شان —— تنہائی میں —— جو شخص اپنے ساتھ نہیں رہ سکتا وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔"

ذی شان نے آرام کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ آرام ایسی باتیں اقتباسات سے اخذ کر کے بولا کرتی تھی اس لیے اس نے جب آرام کو خدا حافظ کہا تو ساتھ ہی اس کی بات کو بھی بھلا دیا۔

اس کے بعد پورے بیس سال تک اس کی ملاقات اپنے آپ سے نہ ہو سکی۔

لندن کی زندگی میں مشاغل اور بھی گوناگوں ہوگئے۔ پاکستان میں مالی، باورچی، دھوبی، جمعدارنی ایسے بہت سے وافر لوگ موجود تھے جو اس کی گھریلو زندگی کو سہل بناتے تھے۔ لندن میں یہ گھریلو کام بھی ان دونوں پر آپڑے۔ عائلہ اور وہ دونوں کام کرتے تھے۔ دونوں مل کر کھانا پکاتے تھے۔ دونوں مل کر صفائی کرتے تھے۔ دونوں مل کر بچے پالتے تھے۔ دونوں تمام چھٹیاں یورپ میں گزارتے تھے۔ چھٹیوں کا پروگرام بنانا ——

سستے ٹکٹوں کی تلاش — سستے ہوٹلوں کا سراغ — اَن گنت مصروفیات تھیں۔

گھر سے کام — کام سے گھر — پھر گھر پہ گھریلو کام!

اس کی زندگی مکمل طور پر اپنی ضروریات، اپنے پیشے کی ضروریات، اپنے خاندان کی کفالت کی نذر ہو گئی اور بیس سال بعد اسے پتہ چلا کہ وہ اندر سے بکھر چکا ہے — تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر واپس پاکستان چلا جائے گا۔

عائکہ اس تبدیلی پر رضامند نہ تھی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ پاکستان میں اسے اپنے ہاتھ سے اپنے ذاتی کام کرنے کی بھی عادت نہ تھی۔ مغرب میں رہنا اس نے اس لیے پسند کیا تھا کہ یہاں ذی شان اس کا گھریلو ملازم تھا۔ وہی GROCERIES لاتا، کار چلاتا، تمام بل ادا کرتا، چونکہ ان کے فلیٹ میں لفٹ عموماً خراب رہتی تھی اسلیے تیسری منزل پر تمام بھاری سامان اٹھا کر لے جانا بھی ذی شان کی شاندار ڈیوٹی تھی۔ مغرب میں کھاتے پیتے گھرانوں کے ایسے لڑکوں کے لیے مشکل زندگی تھی جو عیاش نہ تھے۔ پاکستان میں کوٹھی، کار، ملازم تمام چیزیں مہیا تھیں اور ان کے لیے کوئی جد و جہد یا تگ و دو کرنا نہ پڑتی تھی۔

ذی شان کے لیے مغرب کی زندگی ایک بڑی بیکار جد و جہد کا نام تھا۔ لمبی روٹین جس میں چھٹیاں بھی معمولات کے تحت آتیں لیکن عائکہ پاکستان واپس نہ جانا چاہتی تھی وہ مغربی طرزِ معاشرت میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی آزادی، ایک چھوٹا سا مقام حاصل کر چکی تھی۔ اس مقام اور آزادی کے لیے اُسے بہت محنت کرنا پڑی تھی لیکن وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔

جب ذی شان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پاکستان واپس جا کر بزنس کے امکانات دیکھے گا تو عائکہ اور بچے پیچھے رہ گئے اور اس سفر کے دوران اسے دوبئی ایئرپورٹ پر آرام ملی — وہ ان بیس سالوں میں بھاری ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے پہ بڑی شانتی تھی۔ اس کی

آنکھوں میں کسی قسم کے گلے یا شکایتیں نہ تھیں۔ وہ دونوں ڈیوٹی فری شاپ پہ سینٹ دیکھ رہے تھے جب اچانک ان کی نظریں ملیں۔

"ارے تم آرام!"

"ہائے ذی شان تم تو موٹے ہو رہے ہو اور بال بھی گرے کر لیے ہیں۔"

بڑی مدت کے بعد ملنے سے جو تپاک کی فضا پیدا ہوئی، اس کے تحت وہ دونوں لاؤنج میں ان ڈور پلانٹز میں گھری ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"امریکہ — اور تم ذی شان؟"

"میں وطن — پاکستان۔"

"امریکہ میں رہتی ہو؟" — بڑی لمبی خاموشی کے بعد ذی شان نے سوال کیا۔ اسے کچھ دھندلا سا یاد تھا کہ آرام کا شوہر شکاگو میں کیش اینڈ کیری کا بزنس کرتا ہے۔

"ہاں۔"

"خوش ہو؟ امریکہ میں؟"

"ہاں — جس قدر خوشی ممکن ہے۔" آرام نے آہستہ سے کہا اور پھر چند ثانیے رُک کر بولی:

"اور تم — تم خوش ہو لندن میں؟"

"پتہ نہیں..... میں کچھ کہہ نہیں سکتا — مجھے لگتا ہے جیسے میری زندگی روٹین کی نذر ہو گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں میں بکھر گئی ہے — اچھا کھانا، صاف ستھرے گھر میں رہنا، اچھے بازاروں میں گھومنا — ہر وقت صفائی کا خیال رکھنا — زندگی کیا یہی کچھ ہے؟ اس کے کیا یہی معنی ہیں؟"

آرام مسکراتی رہی۔

"عائکہ بھی کام ہی کرتی رہی ہے۔ میں بھی الجھا ہی رہا ہوں کاموں میں۔ حالانکہ اپنے وطن میں ہمیں سب کچھ میسّر تھا — اور اس کے بدلے مجھے کیا ملا ہے؟ — اونچا معیارِ زندگی! — لیکن معیارِ زندگی ہے کیا چیز؟ — اور جو کچھ مجھے ملا ہے، اس کے عوض میں اندر سے اس قدر کیوں بکھر گیا ہوں آراد — تم نے بھی تو ساری عمر امریکہ میں گزاری ہے۔ کیا تم بھی اپنی زندگی کو اتنا بے معنی سمجھتی ہو — کیا تم بھی بکھری ہو اندر سے؟"

"نہیں۔"

"پر میں — میں کیوں اتنا کھوکھلا ہو گیا ہوں؟"

"اس لیے کہ تم کثیر المقاصد تھے ذی شان — ایک وقت میں کئی آرزوئیں پال کر جینے والا ٹوٹے گا نہیں تو اور کیا ہو گا؟"

"اور تم — تم بھی تو اس بے ہودہ دور کی پیداوار ہو، جب آرزوئیں سرسوں کے کھیت کی طرح اُگتی ہیں۔ تم نے اپنے آپ کو کیسے بچایا؟"

"اندر والے کو تو اندر ہی سے بچایا جا سکتا ہے ذی شان!"

"پر کیسے؟ — کیسے؟"

"میں نے ساری عمر ایک ارمان پالا — اور اندر صرف اس کو سینچا۔ اس کی خاطر جیتی رہی — باقی ساری ACTIVITY تو فروعی تھی — جب خواہش ایک ہو اور اس کی سمت دیکھتے رہیں تو باقی بھاگ دوڑ اندر اثر نہیں کرتی۔"

"وہ ارمان — پورا ہو گیا تمہارا؟"

"نہیں — لیکن خواہش پوری ہو نہ ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ خواہش ایک ہی رہے — ایک وقت میں تو انتشار پیدا نہیں ہوتا — توڑ پھوڑ نہیں ہوتی۔"

ذی شان نے تعجب سے آراد کو دیکھا اور پھر ڈرتے ڈرتے سوال کیا:

"اور وہ خواہش — وہ ارمان کیا تھا؟ — کیا میں پوچھ سکتا ہوں؟"

آراد نے چند ثانیے ذی شان کو دیکھا جیسے بیس سال پیچھے لوٹ گئی ہو۔ ہلکا سا مسکرائی اور ڈیوٹی فری شاپ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی:

"ذی شان! اگر تمہیں بھی معلوم نہیں تو بتانے سے فائدہ — اور پھر میں سوچتی ہوں ارمان تو سینٹ کی بند شیشی کی طرح ہوتا ہے۔ اظہار ہو جائے تو خوشبو اڑ جاتی ہے۔ خواہش باقی نہیں رہتی۔"

آراد ڈیوٹی فری شاپ میں اس طرح داخل ہو گئی جیسے جھومتی جھامتی، ہنستی سُندر بن میں غائب ہو جائے۔

ذی شان سوچتا رہا کہ اس آخری عمر میں — اتنے انتشار کے باوجود وہ کس اکلوتی خواہش کے دھاگے میں اپنی تسبیح کے دانے پرو سکتا ہے؟

خورد سال

گرم کپڑوں کا ٹرنک بند کرنے کے بعد اس کا جی سردیوں کی آمد سے دو سال گیا۔ ابھی پچھلے سال بچوں کے کپڑوں پہ پوری تنخواہ قضا کر گئی تھی۔ اب کے جو دھوپ لگوانے کو سویٹر بن کوٹ نکالے تو بڑے سے بڑا کپڑا چھوٹے سے چھوٹے بچے پر اس طرح کس کر چڑھا کہ بے چارہ انگریزی کا "ٹی" بن کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

سردی تھی کہ تڑپال اوڑھے برآمدے میں کھڑی مسلسل گھنٹی بجائے جا رہی تھی ادھر دل میں جو نائیلون زری کی قمیض بنانے کی حسرت تھی اسے ایک بار پھر سوتی زنبیل میں رکھ کر عابدہ نے اپنا پلاسٹک کا تھیلا اٹھایا۔ پرانے سیاہ برقعے کو اوڑھا اور پرس میں دس روپے ڈال کر سپڑ سپڑ کرتی چلی۔

لوگوں کے پاس تو جانے کس زمانے کے دینار سرخ پڑے تھے کہ سردی کے باوجود بازاروں میں ناچتے پھر رہے تھے —— بوائی پھٹے پیروں کو پائنچوں میں چھپا کر چلتی وہ سنگھاڑے والے کے پاس جا کر رک گئی۔ سیاہ جلد چیر کر بادام کی سی رنگت والی گریاں اُسے بڑی بدعت پہ اُکسا رہی تھیں۔

بالکل ایسی ہی رُت تھی۔ اسی طرح کے دن تھے۔ عین مین اسی طرح کا سنگھاڑے والا

اُن دنوں گھر کی طرف آیا کرتا تھا لیکن وہ تو بہت دنوں کی بات تھی۔ وہ پرانے پرس کو سینے سے لگا کر آگے گلی کی طرف مڑ گئی۔

نانک چندی اینٹوں کا راستہ گھس پس کر کسی بڈھے پھونس کی ہڈیوں جیسا پکیلا ہو رہا تھا۔ سامنے چھوٹی چھوٹی دکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان دکانوں کے سامنے نائیلون کے رنگین دوپٹے دائیں بائیں، پھٹوں پہ سوتی و گرم شالیں اور سفید مارکین کے پھیلاؤ پر مختلف ملوں کی فلالین اور پرنٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ دکان دار اور عورتیں اپنے اپنے داؤ پہ ایک دوسرے سے نبٹ رہے تھے۔ جو عورتیں دکانوں سے بچ کر نکل جاتیں انہیں دکاندار بہت دیر تک باجی جی، آپا جی کی صدائیں دے دے کر بلاتے رہتے۔

ریشمی کپڑوں کے رنگ اور ان کی چمک مدار کی بڑھیا بن کر بار بار عابدہ کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ نہ جانے ان ریشمی کپڑوں کو خریدنے والیاں کیسے مواخذہ بری خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ دکاندار بے دریغ تھانوں کے تھان گزوں میں بانٹے جا رہے تھے —— اور پھر اچھی بھلی تنخواہ کے باوجود ہر مہینے نائیلون زری کی قمیض خوابوں کی الگنی پر ٹنگی رہ جاتی۔

منے کے پاجاموں کے لیے فلالین بہت ضروری تھی لیکن دکانداروں کی شہ دری سے کہیں بھی بھاؤ نہ بنا۔

فلالین کا ارادہ چھوڑ کر وہ جمیلہ کا سویٹر بُننے کی نیت سے جنرل مرچنٹوں کی دکانوں پر رُکنے لگی۔

بچوں کی بلٹیں، لمبے لمبے پاؤڈر کے ڈبے، روغنی کاغذوں میں لپیٹے ہوئے صابن، چابی سے چلنے والے کھلونے، بیٹری میں ڈالنے والے سیل، کوئی ایک ضرورت تو تھی نہیں۔ روپے روپے کی دو دو بنیانیں بیچنے والا بغیر لاؤڈ سپیکر کے سارے

بازار کو اپنے مال کی طرف یوں بلا رہا تھا گویا روزِ آخر سے ڈرا رہا ہو۔

کچھ دکانوں پر تو اس نے اُون اس لیے نہ خریدا کہ وہاں کچھ اتنے زیادہ رنگ نہیں تھے۔ کچھ دکانیں اس لیے نہ پسند آئیں کہ دکاندار کا لہجہ تیزابی تھا۔ کچھ جگہ پھر فلالین کی طرح بھاؤ نہ بنا۔ ایک دو دکاندار اُسے دیر تک آپا جی آپا جی کہہ کر بلاتے رہے لیکن اُن کی دکان پر وہ اس لیے نہ ٹھہری کہ جو خود بلا رہے ہیں ان کا سودا ضرور ناقص ہو گا۔

ایک جگہ اون بھی سستا تھا۔ رنگ بھی اتفاقاً ہلکا مہندی سا بڑا ہی پیارا مل گیا دکاندار بھی خویش برادری کا لگتا تھا۔ پر اُسی وقت عابدہ کو خیال آیا کہ جمیلہ کی تو اگلے مہینے سالگرہ ہے۔ اس کے جو تحفے اکٹھے ہوں گے ان میں شاید کچھ سویٹر بھی ہوں منّے کے پاؤں میں جُوتی نہیں۔ اوپر سے ساس صاحبہ صبح صبح سارے کمروں میں ٹاٹ پھروا دیتی ہیں۔ فرش باسی مُولی کی طرح ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ منّے کا جُوتا پہلے اور باقی چیزیں بہت بعد میں۔ وہ نہ ہو کہ خُسر میاں اٹھیں اور ادھوڑی کی گھٹیلی جوتی بچّے کے پاؤں میں لا ڈالیں۔ پھر ساری سردیاں مروّت میں وہ جوتیاں چٹخانا پھرے اور پاؤں میں گھٹے پڑ جائیں۔

پلاسٹک کے نیم شفاف تھیلوں میں رنگ برنگی چپلیاں کئی گھٹیل دکاندار فٹ پاتھ پر سجائے بیٹھے تھے۔ خالہ سکینہ یہیں سے کاسنی رنگ کی چپلی لے کر گئی ہو گی۔ قیمت تو سوا تین روپے نکلی لیکن خالہ اُس روز دیل کم والے تکیے پر کس ٹھسّے کے ساتھ چپلیوں سمیت بیٹھ گئی تھیں جیسے مُجرا لینے آئی ہوں، کچھ ہنیا خرید لیں۔ فوراً ڈُلکی چال عابدہ کے ہاں پہنچی تھیں۔ پھر ساس سے لے کر چھوٹی نند اور جمیلہ تک کو بار بار اپنی خرید دکھائیں۔ ادھر عابدہ کے منہ پر چھپکا پڑ جاتا۔ بے چاری مسکراتی حالت میں ٹک ٹک دیکھے جاتی۔

منّے کی کالی اور سفید ٹمی سی پوپسی ڈھائی روپے میں آتی تھی لیکن پھر عابدہ نے سوچا کہ ایک بار دس روپے کا نوٹ بھنوا لیا تو بچوں کے کینچے بن کر اسی بازار کی نالیوں میں کھو جائے گا۔ اسی خیال سے نہ تو پھر اس نے گنڈیریاں خریدیں نہ مونگ پھلی نہ چلغوزے والوں کی طرف دیکھا اور نہ ہی بچوں کے لیے چپس کے پیکٹ لیے۔

جب بھی پچھلے دنوں ساس صاحبہ کلیجی پکاتیں، بساندھی سی خوشبو سے عابدہ کو ابکائی آنے لگتی۔ کتنے دنوں سے خیال تھا کہ اس بار قصوری میتھی کے دو چار پیکٹ ضرور لے آئے گی۔ شوربے کے لیے پیالے درکار تھے لیکن دو چار دکانوں پر گجراتی مٹی کے کٹورے اور رکابیاں ٹھنکا کر دیکھ لینے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ یہ دس روپے بچوں کی امانت ہیں۔ ان میں سے نہ تو قصوری میتھی آئے گی نہ پیالے رکابیاں اور پھر دس روپے تڑوا لیے تو بس گئے۔

گھر پہنچی تو سارے بچے ململ کے کُرتے پہنے آنگن میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ساس صاحبہ ساگ کی ہنڈیا چڑھائے پیڑھی میں سمائی پرانی سویٹر ادھیڑ رہی تھیں اس نے پٹے کے ہاتھ چلا کر سارے بچوں کو کُرتے بدلنے کا آرڈر دیا۔

منّا بیچارہ ننگے پیروں دھاگے میں ایک تن تنہا بٹن پروئے سیڑھیوں پر بغیر پاجامے کے بیٹھا تھا۔ اُسے دیکھ کر "امّاں — امّاں —" کہہ کر لپکا اور پلاسٹک کے لفافے سے لپٹ گیا۔

ساس نے پھنسی پھنسی لگی آواز میں پوچھا:

"بڑی دیر لگا دی بازار میں — فلالین لے آئیں؟"

"دام ٹھیک نہیں تھے اماں — اے ہے برقعہ تو اتار لینے دو —" اس نے ٹھنک سے منّے کا سر ٹھونک کر کہا۔

"پھر کیا لائی ہو خرید کر —؟" انھوں نے خالی پلاسٹک کے تھیلے کی طرف

دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ــــ قیمتیں بہت چڑھ گئی ہیں چیزوں کی۔"

جمیلہ نے پاس آکر آہستہ سے کہا۔ "اماں! ــــ چار آنے دو۔ لہسن اور مرچیں لائی ہیں۔"

"میرے پاس کھلا نہیں۔ دس کا ایک نوٹ ہے۔"

"اچھا۔ وس ہی دے دو ــــ" ساس نے کہا۔ "میں خود ہی جاتی ہوں۔ لہسن اور مرچیں بھی لے آؤں گی اور اپنے برقعے کی سلائی بھی دے آؤں گی۔ مہینے بھر سے درزی کے پاس پڑا ہے۔"

عابدہ نے پرس کھول کر اندر دیکھا۔

دس روپے کا ٹھٹھرا ہوا نوٹ باہیں اور ٹانگیں سمیٹے پلاسٹک کے ٹھنڈے پرس میں لیٹا تھا ــــ اپنے اسی خورد سال بچے کو جس طرح وہ بازار کی ساری آفتوں سے بچا کر گھر لائی تھی، اب اس کی آنکھوں کے سامنے اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا تھا۔

عابدہ کو اس طرح ایک دم پریشان ہوتے دیکھ کر ساس نے پوچھا:

"کیا ہوا بہو؟ ــــ"

عابدہ نے مسکرا کر کہا ــــ "سارا دن پھرنے کی وجہ سے چکر سا آگیا ہے خالہ!"

اور پھر ــــ

اس نے وہ خورد سال لاشہ خاموشی سے خالہ کے حوالے کر دیا۔

گاڑی دھچکا کھا کر رکی لیکن اگر گاڑی یوں نہ بھی رکتی تو بھی میں جاگ پڑتی کیونکہ بڑی دیر سے مجھے لگ رہا تھا کوئی کنکھجورا میری گردن پہ ہولے ہولے رینگ رہا ہے۔ ابھی وہ میرے منہ پر آجائے گا اور اپنے سوئیوں ایسے پاؤں میری آنکھوں میں گاڑ دے گا۔

باہر پھیکی چاندنی میں ایک کالا بدہیئت انجن سیاہ چمک دار ناگوں ایسی لائنوں پر شنٹ کر رہا ہے۔ اندر ہمارے ڈبے میں ایک سیٹ پر امی، ایک پر بڑی آپا اور ایک پر زینب آپا ایرانی بلیوں کی طرح سو رہی ہیں۔ غسل خانے کی بتی امی کے بڑے ٹرنک پر روشنی کا گول سفید دھبہ ڈال رہی ہے۔ ادلتے بدلتے پنکھے چھت سے چپکے گھوں گھوں کرتے ادھر ادھر چہرے گھما رہے ہیں۔ سارے ڈبے میں باسی پانی اور تازہ سانسوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ وہ رسالے بھی سیٹ سے کھسک کر فرش پہ پھیل گئے ہیں جن کے سہارے یہ سفر کٹ جانے کی امید تھی ــــ اگر مجھے باجی سے آنکھیں ملانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بھی زینب آپا، بڑی آپا اور امی کی طرح روتی روتی ہی سو جاتی۔

لیکن آج مجھے باجی ڈرا رہی ہیں۔ عرصہ دراز پہلے ایک دن انھوں نے کچھ کہے بغیر مجھے ڈرا دیا تھا۔ امی نے نعمت خانے میں ان کے لیے مٹھائی رکھ کر تالا لگایا تو۔ پھر وہ

چابیاں تخت پر رکھ کر نماز پڑھنے لگی تھیں تو میں نے چابیوں کا گچھا اٹھا لیا اور دبے پاؤں نعمت خانے تک جا پہنچی۔ گرمیوں کی خاموش دوپہر تھی۔ میرے اور امی کے سوائے سب سو رہے تھے لیکن اس کے باوجود میں ڈرتے ڈرتے نعمت خانے کے تالے کو چابی سے کھول رہی تھی۔ جب بڑی ہمت کے بعد میں نے پلیٹ نعمت خانہ سے نکالی تو باجی آ گئیں۔ میں نے پلیٹ میں سے کچھ بھی نہ اٹھایا تھا لیکن باجی نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چور بنا دیا۔

یہ باجی کا مقدر ہے کہ انہیں ہمیشہ سے اچھی چیز بن ملتی ہیں۔ امی مٹھائی کا حصہ رکھیں گی تو باجی کے لیے زیادہ رکھیں گی۔ گھر پر کپڑا آئے گا تو باجی اپنی پسند کا اٹھا لیں گی۔ پکچر جانا ہو گا تو جس فلم کا نام باجی لیں گی سبھی وہی دیکھیں گے۔ اور تو اور دُولہا ملنے میں بھی باجی کا مقدر اپنی بڑی دو بہنوں پر سبقت لے گیا۔ بڑی آپا اور زینب آپا کے دُولھے تو ایسے تھے — خیر جیسے آدمی ہوتے ہیں لیکن باجی کا دُولھا —

اس دن میں نے آنگن دھویا تھا۔ پائنچے بھیگ گئے تھے اور ہاتھوں میں خالی بالٹی تھی۔ سر اٹھا کر میں نے دیکھا، ایئر فورس کی وردی پہنے سنہری مونچھوں والا باوا سامنے کھڑا تھا — لمحے بھر کے لیے میرا دل دھڑکتا دھڑکتا رُک گیا۔ جیسے خواب میں سے اٹھا کر کسی نے تھپڑ مارا ہو۔ پھر سنہری مونچھوں والے باوے نے ہنس کر مجھ سے بالٹی لے لی — اور پوچھا:

"کہاں رکھنا ہے اسے؟"

زینب آپا اور بڑی آپا کے شوہروں سے کتنی مختلف بات تھی۔ ان کے سامنے سارے گھر کی چارپائیاں اندر باہر کرتے سانس پھول جاتی لیکن وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے سگرٹیں پیتے رہتے۔

جب ولایتی باوا تانگے سے اپنا سامان اتروا رہا تھا تو اندر باہر ایک طوفان سا آ گیا۔

سوائے باجی کے سبھی کچھ نہ کچھ کر رہے تھے اور جس لاتعلقی سے وہ بیٹھی کشیدہ کاڑھ رہی تھیں اس سے صاف ظاہر تھا کہ دراصل باوے کا سب سے زیادہ تعلق انہیں سے ہے پتہ نہیں کیوں، اسی روز مجھے باجی سے سخت چڑ پیدا ہو گئی۔

باجی کی ہمیشہ سے عادت ہے کہ خواہ مخواہ چڑانا شروع کر دیتی ہیں۔ بس چھوٹی سی بات میں ایسا الجھاؤ پیدا کر دیتی ہیں کہ رونے کو جی چاہتا ہے۔

ہم چاروں بہنیں بیٹھی نئے باوے کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ زینب آپا بولیں:

"سب کچھ اچھا ہے، ویسے تو یوسف کا سب کچھ اچھا ہے اک ذرا مجھے آنکھیں ناپسند ہیں۔"

مجھے پتہ نہیں ان کی بات سُن کر کیوں غصہ آ گیا، جھٹ بولی:

"کیوں۔ ان کی آنکھوں کا رنگ تو اس قدر خوبصورت ہے جیسے نیلے نیلے کنچے۔"

باجی نے ہنس کر پوچھا۔ "اور تمہیں نیلے کنچے پسند ہیں کیا؟"

میری ناک پر پسینہ آ گیا — میں جھلا کر بولی۔ "ہاں۔ کیوں نہیں؟"

اب باجی کو چڑانے کی سوجھی۔ میرے کندھے پکڑ کر جھلانے لگیں پھر اپنے مخصوص انداز میں لب اٹھا کر بار بار دوہراتی گئیں:

"کیوں تمہارا کروا دیں بیاہ یوسف سے؟ — بولو جی تہمینہ — بولو جی!"

اس سے پہلے کئی بار باجی نے مجھے چڑایا تھا لیکن میں روئی نہ تھی۔ اس دن میں نے کندھے جھٹک دیے اور رونے لگی۔ آنسو تھے کہ آپ ہی آپ آنکھوں میں آ رہے تھے اور گرتے جا رہے تھے۔ بڑی آپا نے گلے سے لگا کر کہا:

"ارے رونے لگیں — یہ باجی تو پگلی ہے تہمینہ — اس کے کہنے سے کوئی تیری شادی تھوڑی ہو چلی ہے یوسف سے۔"

پھر وہ باجی کو ڈانٹتے ہوئے بولیں۔ "خوشی سے لڈو اپنے دل میں پھوٹ رہے ہیں

رُلا اس بے چاری کو رہی ہے۔ اس عمر میں ایسے مذاق نہیں کیا کرتے۔"

پھر سب معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن رات جب میں سونے لگی تو ایک بار پھر آنسو میری آنکھوں میں تیرنے لگے اور میں ہاتھ مروڑتی ہوئی کہنے لگی:

"اللہ میاں کرے باجی تو مر ہی جائے —— مر ہی جائے بالکل ساری کی ساری۔"

باجی میری بددعا سے مر تو نہ سکی۔ ہاں ہمارا گھر چھوڑ کر ضرور چلی گئی۔ انہیں یوسف بھائی کے ساتھ کار میں بٹھا کر ہم سب واپس لوٹے تو آتے ہی میں نے دن رات بجنے والی ڈھولک کو پیر مار کر پھاڑ دیا اور بستر پر اوندھی لیٹ کر رونے لگی۔

سارے گھر میں باسی پھولوں اور پلاؤ قرنی کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ ہر ایک کسی نہ کسی کونے میں بیٹھا باجی کی کمی محسوس کرتا ہُوا افسردہ ہو رہا تھا لیکن مجھے باجی کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب طرح کا غصّہ بھی آرہا تھا۔ ساری شام انہوں نے مجھے بھگا بھگا کر پیر چھلنی کر دیے تھے، پھر بھی جو کوئی تھا ان ہی کی تعریف کر رہا تھا انہیں ہی گھور رہا تھا۔ خالہ نے شام کے دوران میں بس ایک مرتبہ مجھ پر عنایت کی جو پوچھا تھا:

"اب کس جماعت میں ہو تہمینہ —— ؟"

"جی دسویں میں ——"

اس پر وہ ہنس کر بولی تھیں —— "چلو اب تمہاری باری آئے گی ——"

پھر جب باجی اپنے چھوٹے سے بچّے کو لے کر ہمارے ہاں آئیں تو ان کا بچّہ دیکھ کر سب کے منہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔ سنہری بال، سفید رنگت اور کنچوں ایسی نیلی نیلی آنکھیں —— لیکن میں نے دیکھا کہ یوسف بھائی میں پہلے سے بہت فرق آچکا تھا۔ ناک کے دونوں طرف گہری لکیریں پڑ چکی تھیں اور وہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ باجی سارا سارا دن اپنے بچّے کو گود میں لیے کھیلتی رہتی اور میں کنکھیوں سے دیکھتی، یوسف بھائی بے چینی سے منتظر رہتے کہ کب باجی کو فرصت ہو اور وہ اُن سے بھی بات کرے۔ ایسے میں میں یوسف بھائی کے

پاس جا بیٹھتی اور ان سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ ہوائی جہازوں کی اونچی اڑانوں پر مجھے ساتھ لے جاتے۔ ایسے ناگہانی حادثات بیان کرتے کہ دل ہوائی جہاز کے پنکھے کی طرح چلنے لگتا —— پھر ان کی نیلی آنکھوں میں موت سے کھیلنے والے پائلٹ کا سا خوف آجاتا اور وہ اپنے بچّے سے بھی کم عمر نظر آتے۔ میرا جی چاہتا کہ ان کے سنہری بالوں میں انگلیوں کو ڈبو کر کہوں:

"موت سے کیوں ڈرتے ہو۔ وہ تو اپنے پلنگ پر بھی آجاتی ہے۔"

اگر یوسف بھائی کے کچھ اپنے فکر تھے تو ان میں باجی شامل نہ تھیں۔ وہ تو ان چھوٹی موٹی جھلاہٹوں میں بھی یوسف بھائی کے ساتھ شامل نہ ہوتیں جو عموماً میاں بیوی میں خواہ مخواہ لڑائی کی شکل اختیار کر لیا کرتی ہیں۔

یوں تو روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا لیکن اس دن یوسف بھائی غسلخانے میں گھسے ہی تھے کہ مجھے احساس ہُوا کہ اندر کوئی تولیہ نہیں ہے اور ابھی وہ نہا کر تولیے کے لیے پکاریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے باجی کو پکارنا شروع کر دیا۔ باجی اندر پلنگ پر بیٹھی ننھے کو پاؤڈر لگا رہی تھیں۔ انھوں نے سُنی اَن سُنی کر دی تو میں غسل خانے کے کواڑ کے پاس جا کر بولی:

"کہیے بھائی جان ——"

"بھئی ذرا تولیہ پکڑا نا تہمینہ ——"

میں تولیہ لے کر گئی تو وہ کھڑکی کا آدھا پٹ کھولے سر نکالے کھڑے تھے۔ دُھلے دُھلائے چہرے پر شہد کی بُوندوں کی طرح پانی کے قطرے لڑھک رہے تھے اور نیلی کنچوں جیسی آنکھیں بالکل زمرّدیں لگ رہی تھیں۔ گیلے بازو پر تولیہ رکھتے ہوئے انھوں نے پوچھا:

"اور ملکہ صاحبہ کیا کر رہی ہیں؟"

گو میں جانتی تھی کہ باجی کو کوئی ایسا کام نہ تھا لیکن میں بولی —— "جی وہ ننھے کو دودھ پلا رہی ہیں۔"

وہ کواڑ بند کرتے ہوئے بولے :

"اگر انہیں فرصت بھی ہوتی تو بھی وہ کب آتی تھیں۔"

پھر وہ اونچے اونچے کہنے لگے۔ "تہمینہ! شادی کے بعد اپنے شوہر کا خیال ضرور رکھنا اچھا ——!"

ایسی کئی ننھی ننھی باتیں ان بڑے بڑے ناگوں کی طرح میرے ذہن میں ابھر رہی تھیں جن پر ایک کالا بدہیئت انجن شنٹ کر رہا ہے اور جسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہماری گاڑی چل رہی ہو۔ اس بدہیئت انجن کی طرح ایک خیال میرے دل میں آگے پیچھے چکر لگا رہا ہے —— اگر یہ خیال چند لمحے کے لیے مجھے چھوڑ دیتا تو میں بھی بڑی آپا، آپا زینب اور امی کی طرح تھوڑی دیر کے لیے سو جاتی۔

اور سونا تو اُس رات بھی ممکن نہ تھا جب یوسف بھائی کے سر میں بلا کا درد اٹھا تھا —— پہلے تو باجی کچھ دیر بیٹھی دباتی رہی۔ پھر جب ننھا رونے لگا تھا تو وہ اسے چپ کرانے کیلیے اٹھیں اور اسے تھپکتے تھپکتے خود بھی سو گئیں۔ یوسف بھائی کروٹیں بدلتے ہوئے کراہ رہے تھے بڑی آپا نے اسپرو کھلائی مگر افاقہ نہ ہوا۔ امی نے پانی دم کر کے پلایا۔ درد ویسے ہی رہا۔ پھر میں خود بخود اٹھ کر ان کے سرہانے جا بیٹھی اور ان کا سر دبانے لگی۔ سنہری بالوں پر بندھا ہوا سرخ ریشمی رومال میں نے کھول دیا۔ یوسف بھائی نے میری طرف دیکھا اور تکیے پر ڈالا ہوا سر میری جانب اور کھسکا دیا۔

آہستہ آہستہ یوسف بھائی سو گئے۔ ان کا سانس میرے زانو کو چھونے لگا۔

اس رات میں نے کتنی ہی انجانی راہوں پر ڈرتے ڈرتے قدم دھرنے کے خواب دیکھے اور یہ شاید انہی خوابوں کا نتیجہ تھا کہ میں سر دباتے دباتے اُونگھ گئی۔

جب باجی نے مجھے جگایا تو میرے ہاتھ یوسف بھائی کے بالوں میں تھے اور دوپٹہ ان کے چہرے پر پڑا تھا —— پتہ نہیں کیوں اس وقت بھی مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں نے تخت سے چابیاں اٹھا کر نعمت خانے سے مٹھائی نکالی تھی ——!

اگر صبح ہی باجی اپنے گھر جانے کا پروگرام نہ بنا لیتیں تو شاید اتنی شدید نفرت میرے دل میں کبھی پیدا نہ ہوتی —— لیکن ادھر باجی اور یوسف بھائی اپنے گھر روانہ ہوئے اور ادھر میں غم و غصہ سے رونے لگی۔ بار بار مجھے یوں لگتا جیسے باجی جی ہی جی میں مجھ پر الزام دھرتی گئی ہیں۔ جتنا میں باجی کے الزام کے متعلق سوچتی اتنا ہی مجھے اپنے بے قصور ہونے کا خیال آتا۔ اور جب میرا بس نہ چلتا تو میں تکیے میں منہ دے کر کہتی :

"اللہ میاں جی! باجی تو مر ہی جائے بالکل ساری کی ساری ——"

لیکن اب یہی خیال بدہیئت انجن کی طرح میرے ذہن کو کُوٹ رہا تھا —— مجھے پورا یقین ہے کہ میری بددعا نے باجی کی جان لی —— وہ انفلوئنزا سے نہیں اپنی بہن کی بددعا سے مر گئی ہے —— اور اب جب وہ مر گئی ہے تو میں اُسے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ بددعا میں نے جی سے نہ دی تھی —— سٹیشن کی بے رونق بتیوں کی طرح باجی کے گلے میں باسی مرجھائے پھول ہوں گے اور وہ ڈراتے دھمکاتے بغیر مجھے مل کر پوچھے گی: "بولو اب تو خوش ہو؟ —— اب تو خوش ہو؟ ——"

گاڑی دھچکا کھا کر چلنے لگی ہے۔ بدہیئت کالا انجن ہم سے دُور ناگوں ایسی لائنوں پر شنٹ کرتا پیچھے رہ گیا ہے۔ امی، بڑی آپا اور آپا زینب ایرانی بلیوں کی طرح سیٹوں پر پڑی سو رہی ہیں —— لیکن احساسِ گناہ کا ہزار پایہ ہولے ہولے میری گردن پر رینگ رہا ہے ابھی وہ میرے منہ پر آ جائے گا اور میری آنکھوں میں سوئیوں ایسے پاؤں گاڑ دے گا!

اقبالِ جُرم

مجھے اب بھی یقین ہے کہ جس مصلحت کے پیشِ نظر اُس نے اقبالِ جرم کیا تھا، وہ اس کے اعتراف سے بہت مختلف تھی۔

جس وقت نذیر کو سزا کا حکم ہوا میں کورٹ میں موجود نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اس میں دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ ہی یہ تھی کہ مجھے میری دلچسپی کورٹ سے باہر لے گئی۔ میں نے اپنی سائیکل کو وہیں باہر سائیکل سٹینڈ پہ چھوڑا اور قریبی ریستوران میں جا کر چائے پینے لگا۔

اس سہ پہر کو مجھے ساری دنیا اداس اور بھیانک نظر آئی۔ باوجودیکہ ریستوران میں چاروں طرف رنگین کاغذ کی کترنیں اور رنگ برنگے بلب روشن تھے لیکن آنے والی ۲۵ دسمبر کی خوشی میں چھت سے لٹکنے والی رنگین لالٹینیں اور غبارے مجھے بید بے ہودہ نظر آ رہے تھے اور لٹکی ہوئی کترنوں پر مجھے صلیب کا دھوکا ہوتا تھا۔ ہر ایک صلیب پر نذیر آویزاں تھا — اس کی ہتھیلیوں سے لہو بہ رہا تھا۔ پاؤں زخمی تھے اکڑی ہوئی گردن کی نسیں پھولی ہوئی تھیں لیکن اس کا چہرہ عجب سکون سے لبریز، نہایت مطمئن تھا۔

میں نے آدھی پیالی پی کر چہرہ پرے کر لیا۔

کوئی طاقت بار بار مجھے کورٹ روم کی طرف بُلا رہی تھی لیکن میں صلیبی کترنوں سے منہ پھیر کر پیالی پر نظریں جمائے سوچنے لگا اگر نذیر کی جگہ میں ہوتا؟ — اگر نذیر کی جگہ رفیق ہوتا؟ — اگر — ؟

جس روز عذرا کا قتل ہوا، اس روز صبح صبح میں اور نذیر موٹر سائیکل پہ چڑھ کر اس کی گلی میں سے نکلے تھے۔ میری نئی موٹر سائیکل کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑ کر نذیر نے کہا تھا:

"یار! ذرا محبوب کی گلی میں سے گزرتے ہیں۔ ایسی باتوں کا ان لڑکیوں پر بڑا رعب پڑ جاتا ہے"۔

جس وقت ہم موٹر سائیکل پر دندناتے اس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرے وہ لوہے کی سلاخوں والے پھاٹک کے پاس کھڑی سویٹر بُننے میں مشغول تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے لوہے کے پھاٹک پہ پیر جمائے جنگلے کی سلاخوں کو پکڑے جھول رہے تھے اور ان تینوں سے کچھ فاصلے پہ مالی فوارے کے ساتھ پھولوں کو پانی دے رہا تھا۔

ان کی کوٹھی سے تھوڑی دیر پہلے نذیر نے موٹر سائیکل کی رفتار ہلکی کر دی تھی۔ اس کا سرخ مفلر ہوا میں پھڑ پھڑانے لگا تھا اور اس کی گردن بالشت بھر لمبی ہو کر پیلی کوٹھی کی طرف مڑ گئی تھی۔ ان کی کوٹھی سے دس قدم آگے عین بس سٹاپ کے پاس نذیر نے موٹر سائیکل روک کر میرے سپرد کی تھی اور پھر بغیر کچھ کہے سُنے پیلی کوٹھی کی طرف چل دیا تھا۔

جب نذیر واپس آیا تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے

موٹر سائیکل کو سٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے مجھے کہا تھا:

"بخدا ——! میں اس کو مزہ چکھا دوں گا۔ یونہی کسی کے دل سے کھیلنا آسان نہیں ہوتا۔ تم دیکھ لینا اس نے مجھ پہ رفیق کو ترجیح دی ہے لیکن اسے رفیق تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔"

جب کورٹ نے میری گواہی طلب کرتے ہوئے اِن الفاظ کی تصدیق چاہی تھی تو اثبات میں سر ہلانے کے باوجود مجھے پورا یقین تھا کہ ان الفاظ کا نذیر کے عزم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ —— وہ الفاظ نذیر نے جوش اور غصے میں کہے تھے۔ ان کی صداقت کی تصدیق چاہنا ہی فضول تھا۔

مجھے تو وہ رات بھی خوب یاد ہے جب میں اور نذیر رات گئے تک سڑکوں پہ ٹہلتے رہے تھے۔ میری ٹانگیں شل ہو گئی تھیں لیکن نذیر کا قصّہ ختم نہ ہوتا۔

میں اس کے اور عذرا کے تمام حالات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے مجھے ایک ایک دن، ایک ایک ملاقات کی رُوداد یوں سنائی تھی جیسے کوئی فلمی کہانی سُنا رہا ہو —— ہر ایک واقعے کو بیان کرنے کے بعد وہ مجھ سے پوچھتا:

"اور اب تم ہی انصاف کرو کہ اسے مجھے چُننا چاہیے تھا کہ رفیق کو؟"

اور جب میں اس کے حق میں ووٹ دے کر خاموش ہو جاتا تو پھر وہ نئے سرے سے اپنی داستانِ خونچکاں سنانے بیٹھ جاتا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ لارنس باغ کے وسط میں پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا تھا:

"آخری بار مجھے عذرا کو دیکھنا ہے۔ آخری بار"

اور یہ کہہ کر وہ مجھے وہیں چھوڑ کر چل دیا تھا۔

یوں گھنٹے کے بعد جب ہم سڑکوں پہ گھومتے گھامتے گھر پہنچے تو باہر کی بتی کے نیچے

گھر کے تمام افراد جمع تھے۔ امّی کے سر پر دوپٹہ نہ تھا۔ بہنوں کے پیروں میں سلیپر تک نہ تھے۔ نذیر کو دیکھتے ہی یکبارگی سب خاموش ہو گئے اور پھر ننھی یاسمین نے امّی اور خالدہ کے درمیان میں سے سر نکال کر کہا:

"بجّو بھائی! —— آپا عذرا کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

نذیر یکدم دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

نذیر نے جیسے آسمان سے پوچھا: "کب؟ کب؟ ——"

میں آپ سے بھی کہتا ہوں اور کورٹ میں بھی مَیں نے فاضل جج سے یہی کہا تھا کہ نذیر نے عذرا کا قتل کیا ہوتا تو وہ اس کرب سے گھر والوں سے نہ پوچھتا کہ عذرا کو کب کسی نے قتل کر دیا؟

میں جانتا ہوں وہ مجھ سے آدھ گھنٹہ علیحدہ ہو کر عذرا کے گھر گیا تھا۔ کورٹ میں وہ بھی یہی کہتا رہا کہ اسی آدھ گھنٹے میں اس نے عذرا کے سینے میں چُھری گھونپی تھی۔ عذرا کے ڈریسنگ ٹیبل پہ پڑی ہوئی خوبصورت جرمن چُھری سے اس کا سینہ چاک کیا تھا لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آئے گا کہ عذرا کا قاتل نذیر ہے!

ہوٹل میں لٹکی ہوئی رنگین صلیبی کترنوں پہ نذیر آویزاں تھا۔ اس کی ہتھیلیوں سے لہو رواں تھا۔ پاؤں زخمی تھے لیکن چہرے پہ نجات اور سکون کا غازہ لگا ہُوا تھا۔ میں چائے پیے بغیر عدالت میں واپس چلا گیا۔

لیکن تب تک نذیر جا چکا تھا۔ امی اور ابا بھی رخصت ہو چکے تھے اور کورٹ روم کے باہر بیٹھا ہوا چپراسی کہہ رہا تھا:

"بابو جی! مجھے یقین نہیں آتا کہ نذیر میاں نے قتل کیا ہے۔ قاتلوں کے چہرے ایسے نہیں ہوتے —— کہیں جو یہ اپنے منہ سے نہ مانتے تو کاہے کو سزا ہوتی!"

میں نے سائیکل سٹینڈ پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل نکالی اور جیسے اپنے آپ سے کہا:
"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ نذیر نے عذرا کا قتل کیا تھا۔ ہاں جس مصلحت کے پیشِ نظر اس نے اقبالِ جرم کیا تھا وہ کچھ اور تھی!"

بھلا عذرا کے بغیر زندہ رہ کر نذیر کرتا بھی کیا! شاید وہ خودکشی کر لیتا!!

شاید کسی روز پچھلی رات کا سرد چاند اس کی چارپائی پر جھانکتا اور اسے نہ پاکر بادلوں میں چھپ جاتا!

پھر آپ ہی بتائیے اگر نذیر نے اپنے ہاتھوں ایسی موت چُن لی تو آپ اور میں اس پر کیونکر الزام دھر سکتے ہیں!!!

الزام سے الزام تک

عجیب سی بات ہے کہ ہر سال سردیاں آتی ہیں اور ہر سال سردیوں کے کپڑوں کا انتظام نہیں ہو پاتا۔ میں اور میری بیوی کپڑوں کے متعلق آپس میں صلاح مشورے کرتے ہیں فلالین کی صدریاں، اونی ٹوپیاں، گرم سوٹ، سرکی قمیصیں، ڈبل نٹ جرسیاں، پشمینہ دار دستانے اور گرم جرابوں کا ذکر ہماری گفتگو میں عام رہتا ہے لیکن جس وقت نیفتا کی سفید سفید گولیاں جو ساری گرمیاں پرانے گرم کپڑوں میں رہنے کے باعث گھس کر چھوٹی چھوٹی گولیوں کی شکل اختیار کرتی ہیں اور ان گولیوں کا جھڑاؤ پچھلے سال کے کپڑوں سے ہوتا ہے تو میری بیوی سہمی ہوئی میری طرف دیکھتی ہے۔ وہ بھی جانتی ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ اس سال بلکہ آنے والے کئی اور سال سردیاں آتی رہیں گی اور گرم کپڑوں کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکے گا۔

خدا جانے کیا وجہ ہے آج سے دس سال اُدھر ایک سویٹر میں گزارہ ہو جاتا تھا۔ اب بنیان کے اوپر سویٹر قمیض کے اوپر سویٹر اور سویٹر کے اوپر کوٹ کے باوجود ہاتھ شل ہو جاتے ہیں اور موٹر سائیکل کی ہتھی اکڑے ہوئے ہاتھوں سے پکڑی نہیں جاتی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام لوگوں میں دنیا بھر کی دولت برابر بانٹ

دی جائے تو پھر غالباً گرم کپڑوں کی کمی کا احساس اس قدر نہ ہو اور سبھی ایک ایک سویٹر میں نمایاں بجاتے، منہ سے بھاپ اڑاتے اور مونگ پھلیاں چباتے نظر آئیں لیکن میری بیوی کا خیال ہے کہ سردی کا احساس ہی ایسا ہے جس میں گرم کپڑوں کا خیال خواہ مخواہ آتا ہے جیسے جوانی میں عشق و محبت کے خواب۔ دولت کی صحیح یا غلط بانٹ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کبھی کبھی اخبار میں اٹامک ریسرچ والوں کے تجربوں کے متعلق خبریں پڑھ لینے کے بعد میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں —— بھلی لوک! کچھ ہم تم بوڑھے نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ ان تجربوں کی وجہ سے جغرافیائی حالتیں بدل رہی ہیں۔ جو پہلے سمندر تھے اب بحیرے بن رہے ہیں۔ بحیروں نے تنگناؤں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سطح مرتفع میدانوں میں بدل رہے ہیں اور میدانوں میں ریگستانوں کی خاصیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ موسموں کا اعتبار کیا؟ دیکھ لو دسمبر کی پچیس تاریخ جا رہی ہے اور ابھی تک خشک سردی پڑ رہی ہے۔ کبھی یہ بھی سنا تھا کہ کرسمس کی چھٹیاں ہوں اور آسمان ابر آلود نہ ہو ——!

میری بیوی کو سردی لگتی ہے لیکن وہ میری طرح یا جولاہے کے داماد کی طرح سردی میں ٹھٹھر نہیں جاتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کے جسم کو جوانی میں معلوم تھا کہ ابھی آنے والے کئی سالوں تک گرم کپڑوں کا صحیح انتظام نہ ہو سکے گا اور درختوں کی طرح، جو سردیوں کی ساری خوراک اپنے پتوں میں جمع کر لیتے ہیں۔ اس کے پٹھوں کے ارد گرد اس کے ہوش مند اور دور اندیش جسم نے چربی کی فوم ربڑ چڑھا رکھی ہے۔ بد قسمتی سے میرا جسم کبھی میرا دوست نہ تھا۔ ساری جوانی اس نے جو کھایا خدا جانے کہاں گنوایا؟ اب عالم یہ ہے کہ لوگ کپڑے کھلواتے ہیں اور میں پچھلے کپڑوں کو تنگ کر کے پہنتا ہوں۔

میری بیوی کو ایک اور فائدہ بھی ہے۔ گھر میں ننھا سا پوتا ہے جو سارا دن دادی کی بغل میں بیٹھا رہتا ہے۔ ایک تو چولہے کا سینک۔ دوسرے بچے کی گرم بوتل اسے گرمائے رکھتی

اسی لیے جب میں دوسروں کے گرم کپڑوں کا ذکر کرتے کرتے ناشکرا ہو جاتا ہوں تو میری بیوی میرا نقطۂ نظر سمجھ نہیں پاتی اور مجھ سے متفق ہونے کے بجائے مجھ سے الٹا لڑنے لگتی ہے کیونکہ لڑنے بھڑنے کی اسے کافی پریکٹس ہو چکی ہے اور نان سٹاپ کئی کئی پیراگراف اسے ازبر ہیں اس لیے اس طرح لڑنے جھگڑنے میں بھی اسی کا فائدہ ہے کیونکہ تنفس تیز ہو جانے سے لہو کی گردش میں سستی نہیں رہتی اور وہ کئی گھنٹوں کے لیے گرم ہو جاتی ہے۔

کئی سال سے میں اپنی بیوی کو باتوں باتوں میں اس بات پر رام کر رہا ہوں کہ ہم گھر کی یہ تکلیف بآسانی لنڈے بازار سے حل کر سکتے ہیں لیکن میری بیوی ان لوگوں میں سے ہے جو کھلے بناسپتی گھی کو دیسی گھی کے دام پر منگوا کر خوش ہوتے ہیں اور محلے بھر میں اس کے متعلق مشہور رہے کہ اس نے کبھی بناسپتی گھی اور لنڈے کا کپڑا استعمال نہیں کیا اور اکنی کبھی کسی سے ادھار نہیں لی۔ ایسی عورت جو اصولوں میں ذرا سا الاسٹک بھی استعمال نہ کرتی ہو ایسی عورت کو اپنی ضرورت جتائی تو جا سکتی ہے لیکن منوائی نہیں جا سکتی۔

میرا بوس تین ہزار ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ اس کی انشورنس پالیسیاں دو لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ آٹھ نہری مربعے جھنگ میں اور دو کوٹھیاں گلبرگ میں۔ دو کاریں وردی پوش ڈرائیوروں سمیت بغرض آمد و رفت رکھتا ہے —— میرے بوس نے اسی سال جب تین سوٹ میرے ساتھ لنڈے میں جا کر خریدے اور بار بار دکاندار سے کہا کہ یہ سوٹ اس کے پی اے کے لیے ہیں تو میں نے بھی اجو سا تو ہی تھا، ڈرتے ڈرتے ایک بڑا کوٹ اپنے لیے خرید لیا۔ میرا خیال تھا کہ صاحب میری خدمات سے خوش ہو کر یہ تین سوٹ مجھے عنایت کر رہا ہے لیکن واپس دفتر جانے کی بجائے ہم ایک ایسے ٹیلر کی دکان پر پہنچے جو آلٹریشن میں بے مثل ہے۔ اور جس کے ہاں سے پرانا کپڑا نکل کر ریڈی میڈ کپڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے چونکیل جانور کی طرح کان کھڑے کیے اور ابھی اپنا پرانا کوٹ اتارنے کے ارادے ہی کر رہا تھا کہ میرے بوس نے ٹیلر کے سامنے اپنے آپ کو ناپ کے لیے پیش کر دیا۔

انچاس، باون اور چالیس کا بے مثال ناپ دے کر اور ٹیلر ماسٹر کو اَن گنت ہدایات دینے کے بعد ہم لمبی سیاہ کار میں روانہ ہو گئے۔ مجھے سوٹ نہ ملنے کا اتنا رنج نہ تھا جس قدر اوورکوٹ کے پا لینے کی خوشی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ میں لنڈے کا کوٹ لے کر گھر نہیں جا سکتا تھا ــــــ میری بیوی کی محلے بھر میں ساکھ تھی اور وہ اپنے آپ کو میرے بوس سے زیادہ خاندانی سمجھتی تھی۔ اس کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا ہی بہت مشکل تھا کہ یہ کوٹ پرانے کوٹوں کی نئی گانٹھ سے نکلا ہے۔ دفتر کے غسلخانے میں جب پہن کر میں نے اسے دیکھا تو ایک دم مجھے اپنی تنخواہ میں چار سو روپے کی ترقی نظر آنے لگی۔ اپنے کھچڑی پکے بالوں پر پرسنلٹی کا شبہ ہونے لگا۔ جوں جوں میں اپنے آپ کو دیکھتا' اپنے آپ سے اور کوٹ سے محبت بڑھتی جاتی۔

جس وقت میں گھر پہنچا تو کوٹ میرے بازو پر یوں تھا کہ جیسے بڑے صاحب کے منہ میں پائپ

"یہ کوٹ کہاں سے ملا ــــ؟" میری بیوی نے اپنے ننھے پوتے کو گود سے اتار کر پوچھا۔

"خلیق نے دیا ہے۔ اس کے ماموں کویت سے لائے ہیں ــــ"

دفتر میں میرا ایک ساتھی خلیق تھا جو اپنے بجھے ہوئے سگریٹ کا ٹوٹا بھی کسی کو لینے نہیں دیتا تھا۔ اس کے متعلق ایسی سکھا شاہی فراخ دلی کو منسوب کر کے مجھے ہنسی سی آگئی۔

"لیکن وہ تو بہت کنجوس ہے اس نے کوٹ کیسے دے دیا ــــ؟"

"تمہارا خیال ہے مفت دیا ہے؟ پورے تیس روپے دیے ہیں اُسے۔"

کوٹ کو دُوربین جیسی نظروں سے دیکھ کر میری بیوی بولی ــــ "تیس روپے کا؟ ایسا بڑھیا کوٹ؟ ــــ دیکھنا جی کہیں لنڈے کا ہی نہ ہو ــــ"

"لنڈے کا! ــــ بتا تو رہا ہوں کہ خلیق کے ماموں لائے ہیں کویت سے ــــ

مجھ سے اس نے تیس روپے لیے۔ کیونکہ ایک طرح کے دو کوٹ آگئے تھے حسنِ اتفاق سے۔"

کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ نکال کر باہر نکالتے ہوئے میری بیوی آہستہ سے بولی ــــ

"کچھ دل مانتا نہیں ہے ــــ"

میری بیوی ان بیویوں میں سے ہے جو ساری جوانی اعتبار کرتی ہیں بات مانتی ہیں۔ مرد کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی "شکایتاً" نہیں نکلتا ــــ اور بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچتے ہی ان کی گاڑی پیچھے کی طرف شنٹ کرنے لگتی ہے۔ جس طرح پہاڑی علاقوں میں لاکھ زور لگانے پر بھی انجن پیچھے کی طرف جاتا ہے۔ میری بیوی عورتوں کی اس جنس سے تعلق رکھتی تھی جس سے بردوش کی۔ بیوی رکھا کرتی تھی۔ جو کچھ بھی ہو جائے دل میں مشک نافے کی طرح بند رکھنے والی ــــ لیکن یہ بیس برس پہلے کی بات ہے۔

اس واقعے کا تعلق میری شادی سے ہے۔ میری اور میرے چچا زاد بھائی اعجاز کی شادی ایک ہی دن ایک ہی گھر میں دو سگی بہنوں کے ساتھ ہو رہی تھی اور ہماری سعادت مندی یہ تھی کہ ہم دونوں نے اپنی ہونے والی بیویوں سے بات کرنا تو درکنار اُن کی تصویر تک نہ دیکھی تھی۔

شادی سے کوئی ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے کہ اعجاز جو بڑا شاعر طبع تھا اور جسے صنفِ ناز کے حقوق اور ان کے دل کا ہر لحظہ خیال رہتا تھا، میرے کمرے میں آیا۔ میں اس وقت ایک ایسی کتاب پڑھ رہا تھا جس میں شادی کی ہائیجین پر بڑے بسیط مقالے لکھے ہوئے تھے۔

"ایک بات کرنا تھی تم سے ــــ لیکن تم شاید پڑھ رہے ہو؟ ــــ"

میں نے شادی اور ہائیجین کے صفحہ ۲۱۲ پر انگوٹھا پھنسا لیا اور بولا ــــ "نہیں نہیں آؤ بیٹھو ــــ"

اعجاز میں ایک فطری اضطراب ہے جیسے پارے میں ہوا کرتا ہے۔ وہ زیادہ دیر ایک رُخ پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر بیٹھ بھی جائے تو پندرہ منٹ کی نشست میں چار منٹ ٹانگیں ہلاتا

رہے گا، چھ منٹ ناک، کان اور دانتوں تک اس کی انگلیاں آتی جاتی رہیں گی۔ دو ایک منٹ کالر کی درستی پر صرف ہوں گے اور باقی ماندہ وقت وہ لمبی سی گردن میں نرخرے کو یوں اوپر نیچے کرتا رہے گا جیسے فُل بائل انڈا حلق میں پھنس گیا ہو ــــ کرسی کے کنارے پر بے تابی سے بیٹھ کر کرسی کا پینٹ ناخن سے چھیلتے ہوئے بولا:

"شادی اپنی پسند کی ہونی چاہیے جس میں عورت اور مرد اپنی پسند سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیں ــــ"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر عورت بالآخر عورت ہے اور ہر مرد بالآخر مرد ہوتا ہے اور اسے عورت سے جنسی لگاؤ کے علاوہ اور کچھ درکار نہیں ہوتا ــــ"

اسے میری بات سن کر یکدم ٹھنڈا پسینہ آگیا:

"تم بالکل وحشی ہو ــــ وہی وحشی جس نے حضرت حمزہؓ کے پیٹ میں برچھا مار کر انہیں شہید کیا تھا ــــ"

میں اعجاز کی دو باتوں سے مرعوب رہا ہوں۔ ایک تو جس طرح سچے جذبے اور نیکی کے ساتھ وہ عورتوں کے لیے محسوس کرتا ہے اور دوسرے جس طرح وہ قدم قدم پر مسلم ہسٹری سے حوالے دے کر دوسرے کو بے زبان کر دیتا ہے۔ مجھے یکدم لگا میں ایک گوریلا ہوں جو ابھی ابھی غاروں سے نکل کر باہر آیا ہوں۔ بقول اعجاز ہی، ابوسفیان کی وہ سفاک بیوی ہندہ ہوں جو حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبا چاٹ گئی تھی۔

"عورت بہت مظلوم ہے ــــ"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مرد پہلے اس کے ساتھ من مانی کرتا ہے اور پھر اُسے بے رحم معاشرے کے سپرد کر دیتا ہے ــــ"

"ہاں یار ــــ" میں نے ملزموں کی طرح سر جھکایا۔

"اب اس سے بڑا اور کیا ظلم ہے کہ پہلی رات بغیر جانے بوجھے دولہا اپنی دولہن سے جسمانی بے تکلفی برتے ــــ خود بتاؤ عورت کے دل پہ کیا گزرتی ہوگی ــــ"

میں عورت کے دل کی بات تو نہیں جانتا تھا لیکن چونکہ اعجاز کہہ رہا تھا کہ یہ ظلم ہے اس لیے میں نے جلدی سے کہا:

"واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے ــــ"

"میں تمہارے پاس اس لیے حاضر ہوا تھا کہ تم میرا ساتھ دو ــــ"

کانپتی آواز میں میں نے سوال کیا ــــ "کیسا ساتھ؟"

"ہم اپنی ہونے والی بیویوں کو نہیں جانتے ــــ"

"نہیں جانتے ــــ"

"اور ہمیں انھیں جانے بغیر اُن سے کسی قسم کے وحشی فعل نہیں کرنے چاہییں۔"

"نہیں کرنے چاہییں ــــ"

"تو یوں طے پایا کہ جب تک ہم ان سے یعنی تم اپنی بیوی کے ساتھ اور میں اپنی بیوی کے ساتھ مکمل طور پہ گھل مل نہ جائیں تب تک ہم ان سے جسمانی بے تکلفی نہ کریں گے۔"

میں تو سر سے پیر تک لرز گیا ــــ اب خدا جانے دولہن بیگم کیسے مزاج کی ہوں۔ گھنٹوں کی راہ پل میں طے کرنے والی یا دنوں کے راستے کو برسوں پر پھیلانے والی۔ کون جانے ان کی شخصیت پیاز جیسی ہو۔ پرت پر پرت کھولتا رہوں اور اندر سے کچھ بھی نہ نکلے۔

"خاموش کیوں ہو تم ــــ میرا خیال ہے مکمل واقفیت پیدا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ درکار ہوں گے۔"

"چھ ماہ ــــ!"

میرا جی چاہا کہ کہوں ــــ تو چلو میں چھ ماہ بعد شادی کروا لوں گا لیکن جس طرح فُل بائل انڈا اس کی گردن میں اوپر نیچے پھدک رہا تھا اسے دیکھ کر بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

"لیکن کم از کم دو ماہ کا وعدہ تو تم مجھ سے کرو"۔

اس نے رومال والی جیب سے ایک منے سے حجم کا قرآن کریم نکالا اور ہتھیلی پر رکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو سے اس قدر نہ بوکھلایا تھا جتنا اس مختصر سائز کے قرآن کریم کو دیکھ کر بدکا۔

"دو مہینے میں وہ خود ایسی باتوں پر مائل ہو جائیں گی اور جب تک عورت خود مائل نہ ہو اس سے کوئی تعلق رکھنا بیکار ہے ——"

"بالکل بیکار ہے ——"

اعجاز میرے حلفیہ بیان کے بعد دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا —— "میں نے تمہارے متعلق سارے نظریے بدل لیے ہیں۔ خدا کی قسم! تم سر سے پیر تک جنٹلمین ہو —— مجھے تو شبہ تھا بلکہ میں ڈر رہا تھا کہ اگر تم نہ مانے تو کیا بنے گا ——"

خیر اس کے بعد جو کچھ بنا —— اس کی تفصیل ناگفتہ بہ ہے۔

اعجاز کی بیوی ہفتہ بھر کے بعد میکے جا بیٹھی اور اعجاز مکمل طور پر نفسیاتی کیس بن گیا۔ جو بھی اس کے سسرال جاتا تھا ایک ہی بات لے کر واپس آتا تھا کہ اعجاز کے سسرال والیاں سمجھتی ہیں کہ اعجاز سرے سے مرد ہی نہیں ہے۔ عورت سے ہمدردی کرنے کا جو صلہ اسے مل رہا تھا اس پر ہم دل ہی دل میں خوش تھے اور ہم نے چونکہ اپنی بیوی کو اپنے حلفیہ وعدے کی ساری کہانی من وعن سنا دی تھی اس لیے وہ منہ میں مصری لیے بیٹھی تھیں اور روز کیلنڈر کا صفحہ الٹاتے ہوئے الحمد للہ پڑھا کرتی تھیں۔

کس طرح پورے بیس دن بعد اعجاز صاحب کی بیوی کمال منت وسماجت کے بعد واپس آئی اور کس طرح اعجاز کو اس سے مجبوراً بے تکلف ہونا پڑا' یہ ایک دوسری داستان ہے اس روز جب بھابی دوبارہ گھر آئی ہے تو اسی رات اعجاز مجھے ملنے آیا۔ بے چارہ باسی کیک کی طرح نہایت بے رونق ہو رہا تھا۔

"ایک بات ہے بھائی ——"

"فرمائیے ——"

"تم مجھے میرے وعدے سے رہا کر دو —— جیسا میں نے تمہیں معاف کیا"۔

"کیا مطلب —— ؟"

"مطلب یہی کہ میں اپنا وعدہ نبھا نہیں سکتا —— اگر تم مجھے رہا کر دو گے تو میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرے گا ——"

"ضمیر کو گولی مارو یار ——"

"عجیب سی بات ہے —— میں تو سمجھتا تھا کہ عورت فقط پاک محبت کی طالب ہوتی ہے مرد سے ——"

"اس کی بھی طالب ہوتی ہے —— لیکن بعد میں ——"

"تم —— تم مجھے رہا کر دو ——"

"بھائی رہا ہی رہا ہو ——"

اس واقعے کو بیان کرنے سے فقط ایک ہی بات مقصود تھی کہ ہماری بیوی نے شادی کے بعد پورے اکیس دن ہمارے نامرد ہونے کا اعلان کسی سے نہیں کیا۔ غالباً یہ عورت کی معراج ہے کہ وہ اتنی بڑی بات کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اگر وہ بھی اپنی بہن کی طرح ہوتی تو آج چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کے شوہر کے متعلق بھی یہی مشہور ہوتا کہ برے کاموں کی وجہ سے یہ حضرت شادی کے وقت شادی کے قابل نہ تھے۔

لطف کی یہ بات ہے کہ وہی میری بیوی جو اتنے بڑے راز کو اکیس دن بیٹھی سیتی رہی اب اس کا یہ عالم ہے کہ ذرا سی بات کو بھان بنا لیتی ہے۔ پھر اس کتھا سے ہر آنے جانے والے کے لیے چلغوزے، اموگم پھلی کا ایک طشت سجایا جاتا ہے بطور تواضع ——

میرا کوٹ کیا آیا محلے کی عورتوں نے اسے چھو چھو کر دیکھا اور اس کی قیمت پوچھی۔ اسی

چھان پھٹک میں اس کی اندرونی جیب سے تین چابیاں برآمد ہوگئیں۔ لنڈے کے ایک پرانے کوٹ میں سے تین چابیوں کا برآمد ہونا معمولی سی بات ہے۔ سنا ہے خوش نصیبوں کو اس میں سے ڈالر ملتے ہیں اور بدنصیبوں کو گیسو لین کی پرچیاں۔

چھوٹا امریکی خوبصورت چھلا لے کر میری بیوی میرے پاس آئی اور بولی:

"یہ کوٹ کہیں خلیق نے استعمال کے بعد تو تمہیں نہیں دیا؟"

"کمال کرتی ہیں آپ۔ بتا تو چکا ہوں کہ ان کے ماموں کو بہت سے لاٹے ہیں۔ دو ہمشکل کوٹ تھے اس لیے ایک میں نے لے لیا۔"

"تو پھر یہ چابیاں کیسی تھیں بیچ میں؟"

"چابیاں اتنی خوبصورت تھیں اور ان کا چھلا اس قدر نادر کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر چابیاں اس سے لیتے ہوئے کہا:

"واہ! یہ کہاں سے ملیں تمہیں — یہ تو میری چابیاں ہیں دفتر کی۔"

میری بیوی کے ماتھے پر گہری شکنیں پڑ گئیں:

"آپ کی چابیاں؟ — آپ نے تو کبھی ذکر نہیں کیا ان چابیوں کا۔"

"دفتر کی جو ہوئیں — ایک تو بیورو کی ہے۔ ایک میرے ڈیسک کی اور ایک صاحب کے سیف کی —"

"دکھائیے —"

میں نے چابیاں اس کی تحویل میں دے دیں۔

"کیا رکھتے ہیں آپ کے صاحب اپنے سیف میں؟"

شامتِ اعمال سے میں نے کہا: "کچھ تو کانفیڈنشل فائلز ہیں اور کچھ صاحب کے پرائیویٹ خطوط ہیں۔"

"پرائیویٹ خطوط —؟ گھر کیوں نہیں رکھتے؟ —"

"کمال ہے! ایسے خط گھر پر تھوڑی رکھے جا سکتے ہیں —"

"اچھا — چھا!"

کوٹ تو اب ہماری زندگی کے درمیان سے کیسر نکل گیا اور یہ چابیاں درمیان میں غالب کے سر سے گرے بوجھ کی طرح آ گریں۔

جب عورت نانی دادی ہو کر مرد پر شبہ کرتی ہے تو اس کے لچھن ہی بدل جاتے ہیں۔ اب اگر میں وہ چابیاں سنبھال کر رکھتا تو مجھے طعنے ملتے کہ ہاں ہاں جی! سنبھال کر رکھیے۔ کسی کے ہاتھ لگ گئیں تو کہیں اصل پول نہ کھل جائے۔ اگر میں اپنی لاتعلقی سے میز پر یا کسی اور جگہ چھوڑ جاتا تو بڑے اہتمام سے واپس لا کر مجھے دے جاتیں اور تاکید سے کہا جاتا — "اب یہ چابیاں کوئی ادھر اُدھر پھینکنے والی چیز ہیں۔ آپ بھی حد کرتے ہیں۔"

مجھے بیٹھے بٹھائے چابیوں کا آزار ہو گیا۔ رات کو سوتا تو انہیں تکیے کے اوپر پاتا — صبح اٹھتا تو انہیں شیو کے گرم پانی کے ساتھ پڑا پاتا۔ دن میں کئی بار مجھے پکڑائی جاتیں اور کئی بار میں انہیں امانتاً اپنی بیوی کے پاس رکھتا۔ کوٹ لا چھپاکی کے کوٹلے کی طرح ہر بار جب یہ چابیاں مجھے نظر آتیں تو مجھے لگتا کہ اب یہ کوٹلا میری کمر پہ پڑا کہ پڑا —

تین خوبصورت سٹین لیس سٹیل کی چمکتی ہوئی بے زبان چابیاں! —

میں رات کو کبھی کبھی ان کا گول چھلا ہاتھوں میں گھما کر دیکھتا۔ ایک چابی ذرا لمبی تھی اور دروازے کے تالے کی نظر آتی تھی۔ میں اسے دیکھتا تو خواب کی آنکھ میں وہ ایک طاق کھول کر مجھے ایک ایسے کمرے میں راہ دیتیں جو شاید کوٹ والے کا اپارٹمنٹ تھا۔ دیواروں پر لگا ہوا گہرے رنگ کا وال پیپر۔ کوٹ اور ٹوپی لگانے والا ہینگر۔ خدا جانے اس چابی کا مالک نوجوان تھا کہ بوڑھا — خدا جانے شادی شدہ تھا کہ مجرّد — کون جانے عیاش ہو اور یہ چابی دراصل کسی اور اپارٹمنٹ کی ہو جس میں وہ ہر ہفتے محض ویک اینڈ منانے جاتا ہو — !

میں نے اس چابی سے ایک مکمل صورت تشکیل کر لی تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ ضرور ہو گا۔ یقیناً نوجوان ہو گا۔ اس رنگ کے کوٹ وہاں نوجوان ہی پہنتے ہیں۔ بوڑھوں کا تو یہ فیشن ہی نہیں ہے اور اس کے رنگ ہی سے لگتا تھا کہ نوجوان بھی تھا اور طرحدار بھی اور محبوب طبع بھی ــــ چلتا ہو گا تو دائیں پاؤں پہ ذرا زیادہ وزن ڈالتا ہو گا۔ بچپن میں کہیں ہلکا سا پولیو کا اٹیک ہوا ہو گا۔ ذرا سا نقص ٹانگ میں رہ گیا جو اس کے حسن میں بڑھ کے جاذبیت پیدا کرتا ہے ــــ لڑکیوں سے بات کرتا ہے تو بھوری آنکھیں اور بھی شربتی ہو جاتی ہیں۔ سورج اس کی پشت پر چمکتا ہو تو کرنیں بھورے بالوں میں سے چھن چھن کر ایک سرخ سی روشنی پیدا کرتی ہیں۔

خدا جانے کیسے اور کیونکر اس چھلے والے کے ساتھ میں نے اپنی شخصیت کو مدغم کر لیا۔ اب سونے سے پہلے چھلے والا یعنی میں خود اپنا اوورکوٹ پہن کر نیویارک کی ایک سات منزلہ عمارت پر تیسری منزل پر لفٹ میں پہنچتا۔ لمبی گیلری میں ہوتا ہوا کمرہ نمبر ۲۲۲ کے چمکتے تالے میں چابی پھنساتا۔ دروازہ کھلنے کی آواز ہرگز نہ آتی۔ صرف ہاتھ کا دباؤ بتا دیتا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ اندر پہنچ کر میں اپنی ٹوپی اور کوٹ ہینگر پہ ٹانگتا۔ کھڑکی کے نیچے چیونٹیوں کی طرح چلنے والی ٹریفک کو دیکھتا اور پھر ایک لمبی الماری میں دوسری چابی فٹ کر کے کھولتا۔ اس چابی کے لگتے ہی دیوار کا تختہ، جو بظاہر دیوار کا حصہ نظر آتا تھا، دیوار میں اندر کی طرف خاموشی سے گھس جاتا۔ الماری کے اندر ایک چھوٹے سے شیلف میں تیسری مونیا کی گلی جیسی چابی پھنسا کر میں ایک خفیہ دراز کھولتا اور ایک ننھی سی ایسی پستول نکالتا جسے چلاؤ تو رتی بھر پٹاخے کی آواز نہیں آتی۔ اس پستول کو جو غیر قانونی طور پر میری ملکیت تھا اندرونی جیب میں رکھ کر میں شیلف اور الماری بند کرتا۔ اوورکوٹ کے کالر اوپر اٹھاتا اور کمرے کو لاک کر کے باہر نکل جاتا۔

میں کبھی امریکہ نہیں گیا۔

لیکن وہ ساری امریکن فلمیں جو میں اپنی بیوی کے ساتھ اسے خوش کرنے کے لیے دیکھ چکا ہوں۔ اس وقت جب چابیوں کا چھلا میرے ہاتھ میں اور سر تکیے پہ ہوتا میرے کام آتیں۔ میں ننھی پستول کو جیب میں ڈال کر جیمز بانڈ سیریز کا ہیرو بن جاتا ہوں ــــ کبھی ہانگ کانگ میں سارنگ میں ملبوس لڑکیوں کے ساتھ، کبھی وادیوں میں، کاروں میں، چیز کرتا ہوا ــــ کبھی روس میں بھیس بدل کر اور کبھی ٹوکیو میں جاپانیوں سے جوڈو کھیلتا ہوا ــــ

یکدم زندگی پستول کی گولی کی طرح قابو سے نکل گئی۔ میں سارا دن رات کا انتظار کرتا رہتا جب چابیوں کو پکڑتے ہی میرے تخیل کا تالا کھل جاتا۔ اب میں فلموں سے بہت آگے سوچنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ میری پریکٹس اس قدر بڑھ گئی کہ میں بیک وقت ولن اور ہیرو کا پارٹ ادا کرنے لگا۔

کچھ تو ان تصورات کا اثر میری عملی اور دن کی زندگی پہ ہونا ضرور تھا۔ اب فجر کی نماز عام طور پر قضا ہونے لگی۔ میں چوری چوری برل کریم خرید کر بالوں کی پٹیاں جمانے لگا۔ اگر مجھے اپنی بیوی کا اس قدر دھڑکا نہ ہوتا تو شاید میں بالوں کو پولی کلر سے رنگ بھی لیتا۔ بوٹ جو پہلے کئی کئی دن تک پالش نہیں ہوتے تھے اب باقاعدگی سے چمکنے لگے۔ میرا معمول تھا کہ ہر شام اپنے ننھے پوتے کے لیے تھوڑی سی میٹھی سونف خرید لایا کرتا تھا لیکن اب میں نے ذرا قیمتی قسم کے سگریٹ پینا شروع کر دیے تھے اس لیے باقی تمام اخراجات اسی کی نذر ہو جاتے تھے۔ مہینے بھر کا سودا سلف لانا میری ذمہ داری تھی۔ اب میں شروع مہینے میں اپنی بیوی کے لیے ہر قسم کی رنگدار عینک لمبی نائیلون کی جرابیں اور خوبصورت رومال لایا تو وہ بجلی لوگ خوش ہونے کے بجائے الٹا بھڑک اٹھی:

”یہ سب آپ کیا سمجھ کر لائے ہیں؟“

”دراصل مرد کو تحفہ دینا کبھی نہیں آتا۔ وہ جوان لڑکی کو کتابیں اور بوڑھی عورت کو

لپ سٹک پیش کرتا ہے۔

'یہ ـــ میرا خیال تھا کہ تم یہ سب کچھ پسند کرو گی۔'

'یہ ـــ میرے استعمال کی چیزیں ہیں؟ بتائیے!'

'عینک لگا کر تو دیکھو، تمھیں سجے گی۔'

'لیجیے دیکھیے ـــ ضرور دیکھیے اور اڑائیے میرا مذاق۔'

جس وقت میری بیوی نے چورس فریم والی عینک لگائی جس پہ پلاسٹک کے رنگین ستارے سے جڑے تھے تو پہلی بار میں بھونچکا رہ گیا۔ اتنا پاس رہنے کے باوجود ایک بار بھی مجھے شبہ نہ ہوا تھا کہ وہ اس عمر میں نہیں ہے، جب ایسی چیزیں سجاوٹ پیدا کرتی ہیں۔

'جانے دیجیے۔ یہ سب کچھ لوٹا کر آئیے۔'

چیزیں تو میں نے لوٹا دیں لیکن میں اُن خیالات کو دکاندار کے کاؤنٹر پہ نہ چھوڑ سکا جو جماہیوں نے عطا کیے تھے۔ سردیوں کی رات میں ویسے بھی گرم لحاف بہترین دوست ہوتا ہے۔ اب جو جماہیوں نے کھلی آنکھوں خواب دیکھنے کی عادت ڈال دی تو میں سرِشام ہی چارپائی کا سہارا ڈھونڈنے لگا۔ خدا جانے یہ سلسلۂ خیالات کیا گل کھلاتا اور اس کی تان کہاں جا کر ٹوٹتی لیکن ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ہمارے دفتر میں ریسرچ آفیسر ایک تیس سالہ نوجوان عورت ہے۔ بدقسمتی سے وہ دو عیبوں سے متصف ہے۔ ایک تو زیادہ پڑھی لکھی ہے دوسرے صورت شکل سے لڑکے کا مال معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں خاصیتیں مردوں پر عموماً بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ وہ ریسرچ آفیسر کو یکسر عورت ہی نہیں سمجھتے تھے اور اس کی موجودگی میں جنسی لطیفوں کی بھرمار کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتے تھے۔ مس آصفہ بھی غالباً مردوں کی کور ذوقی کی عادی ہو چکی تھیں اس لیے ان کا رویہ ہم سب سے کامریڈ قسم کا تھا۔ وہ فری لفٹ مانگ کر خوش ہوتیں۔

ہم لوگوں سے سگریٹ لے کر پینے میں انھیں باک نہ تھا اور وقت بے وقت دفتر کے ہمرکابوں کے ساتھ پکنک وغیرہ پر جاتے ہوئے بھی وہ شرماتی نہیں تھیں۔

مس آصفہ میں وہ خوبیاں نہیں تھیں جن سے لوگ عشق کیا کرتے ہیں اور وہ بھی غالباً اس بات سے اچھی طرح واقف تھیں اس لیے انھوں نے کبھی ایسی اداؤں کا اظہار نہ کیا جو عورت کو مرد کے لیے عزیز بناتی ہیں۔ یہ انھیں سردیوں کا ذکر ہے کہ مس آصفہ نے میرے گھر اور دفتر کے عین درمیان کرائے پر مکان لے لیا۔ اب وہ کبھی کبھی مجھے بس سٹاپ پر اکیلی کھڑی نظر آنے لگیں۔

سردیوں کی صبح کو بس سٹاپ پر اکیلی کھڑی عورت، بڑا دلدوز منظر ہے اور وہ بھی جب قریب سے ہیٹر لگی کاریں زوں زوں گزری جا رہی ہوں اور وہ فرگیے کوٹ کا کالر کانوں تک اٹھائے، آنکھوں پہ سیاہ چشمہ لگائے، ہاتھ میں لیدر کا بڑا سا بیگ لیے بس سٹاپ کے سامنے بجلی کے کھمبے سے لگی کھڑی ہو۔

ایسے ہی کرب ناک منظر سے مرعوب ہو کر میں نے ایک دن موٹر سائیکل پہ انھیں لفٹ دے دی۔ ویسے تو میری بیوی کئی مرتبہ میرے پیچھے موٹر سائیکل پہ بیٹھی ہے لیکن وہ اور میں اس قدر ایک ہی جسم کا حصہ ہو چکے ہیں کہ اس کے بیٹھنے سے یہی احساس ہوتا ہے جیسے میں ہی اکیلا موٹر سائیکل پہ بیٹھا ہوں۔ مس آصفہ حیدری نے کیوٹکس لگی انگلیاں میرے کندھے پر رکھیں اور بہت احتیاط سے رکھیں اور نہایت لاتعلقی سے رکھیں لیکن اجنبی ہونے کی رعایت سے اپنے آپ سے پرے ہونے کے لحاظ سے، تجربے کے نئے پن کے اعتبار سے وہ مجھے اچھی سی لگیں۔

عورت کو بڑا آرام ہے ـــ اُسے دنیا میں ایک آدمی اچھا لگتا ہے اور باقی سارے مردوں سے اُسے نفرت ہو جاتی ہے۔

مرد کو عورت ذات سے پیار ہے ـــ یہ کسی روپ میں کہیں بھی ہو اُسے اچھی لگے گی۔

اب اسی کمبختی کے پیشِ نظر مجھ سے ایک غلطی سرزد ہونے لگی۔ میں ہر روز بس سٹاپ پر

انتظار کرنے لگا اور جو کسی روز مس آصفہ حیدری بس میں جا چکی ہوتیں تو مجھے دل ہی دل میں ایک طرح کا افسوس سا ہوتا — پھر رفتہ رفتہ دفتر سے واپسی پر بھی وہ میرے ساتھ آنے لگیں۔

اب یقین کیجیے کہ اس معاملے میں اس سے آگے پیچھے اور کچھ نہیں ہے — ایک معمولی سی لفٹ — جو ایک دن میری بیوی نے بس میں جاتے ہوئے دیکھ لی — تو سمجھیے کہ گھر پر قیامت کا نزول ہوا۔

جب بیوی جوان تھی تو وہ میری اصلی نقلی اور خیالی محبوباؤں سے نہیں جلتی تھی تب اسے اپنے کس بل پہ بہت مان تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جائے گا کہاں تک — اور اب جبکہ اس کے جسم پر فوم ربڑ چڑھ چکا ہے، چہرے پر بالوں نے یلغار کر دی ہے۔ آواز بھاری اور بھدی ہو چکی ہے۔ اب جبکہ کوئی چیز اسے غیر شعوری طور پہ سائرن بجا بجا کر بتاتی ہے کہ اس میں قوتِ مدافعت نہیں ہے۔ وہ ہر پچھو ندر صورت عورت یا لڑکی کو چار سو بیس حریف سمجھتی ہے — خدا جانے سائیکلوجی والے کیا کہتے ہیں اور اس بڑھاپے کے حسد کے متعلق انھوں نے کیا حل دکھائے ہیں لیکن میں اس قدر جانتا ہوں کہ ایسے معاملے میں مرد بے چارے پر بھڑبھس کا الزام لگتا ہے اور یہ الزام اس کی نامردی کے الزام سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے جو جوانی میں ایک کنواری دلہن لگا سکتی ہے۔

مس حیدری سے جلنے کی تین سٹیجیں آئیں۔

پہلے تو میری بیوی چپکے چپکے روئی اور اندر ہی اندر پتہ کرواتی رہی کہ یہ لفٹ کس کو دی جاتی ہے؟

پھر اس نے اشارۃً بے وفائی اور کج ادائی کے طعنے دینے شروع کیے۔

بعد ازاں جب مجھ پر کوئی اثر نہ پایا تو کھلم کھلا پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ مقدمہ دائر ہوا اور پرانی ساری مروت بھلا کر مجھے اپنا جانی دشمن سمجھ بیٹھیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کی کھوپڑی کیسے سوچتی ہے۔ اسے غربت میں رکھو۔ آدھی روٹی کھلاؤ، ہنستی کھیلتی رہے گی لیکن سونے کا نوالہ کھلاؤ اور کسی دوسری عورت کی جانب آدھی نظر بھی ڈال لو تو تختِ طاؤس کو لات مار کر سنیاس لے لے گی۔ اپنا گھر برباد کر لے گی اور مرد کی عافیت تباہ کر دے گی۔

میری بیوی کا مجھ سے کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا — یعنی تاوقتیکہ اس کی گود میں پوتا نہیں تھا۔ پوتے کی آمد کے بعد اختلافات کچھ اس قسم کے ہوتے کہ میری بیوی بولتی رہتی اور میں سنتا اور کڑھتا رہتا۔ اسی لیے یہ اختلاف کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوئے لیکن اس بار تو جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور شگاف سا پڑ گیا ہم دونوں کے درمیان — میں نے قسمیں کھائیں۔ وعدے کیے۔ حلفِ وفاداری اٹھائے لیکن شکوک تھے کہ راکٹ کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتے تھے — بالآخر میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ آئندہ مس حیدری سے کوئی کلام نہ رکھوں گا۔ اس سے میری بیوی کے شکوک تو رفع نہ ہوئے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے مجھ پر اور میری قسم پر اعتبار کر کے اس بات کا ذکر چھوڑ دیا۔

اب پاسِ قسم سے ایک مشکل اور درپیش ہوئی۔ میں روز مس حیدری کو لفٹ دیا کرتا تھا اور وہ سردیوں کی صبح کو میری منتظر رہا کرتی تھی۔ اب میں رستہ بدل کر دفتر جانے لگا۔ دفتر سے واپسی پر بھی میں کہیں نہ کہیں چھپ جاتا۔ میری اس بے اعتنائی نے ایک اور گل کھلایا۔ مس حیدری جو مردوں کی طرح دفتر میں زندگی بسر کر رہی تھیں یکدم عورت بن گئیں۔ انھیں میرے ساتھ دفتر میں کام کرتے پورا چھ سال تھا اور ان چار سالوں میں ان کی ذات سے سرکاری اور غیر سرکاری ایک بھی سکینڈل منسوب نہ ہوا تھا۔ بے چاری اپنے طرز کی نہایت بے ضرر خاتون تھیں۔ لوگوں کی شادی شدہ زندگی تباہ کرنے کا انھیں خیال بھی نہ آ سکتا تھا۔ لیکن میں جو اُن سے چھپنے لگا اور اپنی جان چرانے لگا تو سوئی ہوئی نیند سے شہزادی جاگی اور پہلا مرد جو اسے نظر آیا، وہ میں تھا۔

پہلے تو ایک دن میرے کمرے میں میری غیر موجودگی میں ایک نوٹ لکھ کر چھوڑ گئیں کہ میں اُن سے مل لوں لیکن جب میں نے ان سے ملنے کی کوشش نہ کی تو دوسرے دن وہ میرے کمرے میں آئیں اور بڑی دیر بیٹھی رہیں لیکن میں بڑی شدت سے ٹاپ کرتا رہا اور اس دوران کئی بار اٹھ کر بوس کے کمرے میں گیا۔ اس کے بعد وہ عموماً کمرے میں چھوٹی چھوٹی سرکاری الجھنیں اور سرکاری گوسپ لے کر آنے لگیں۔ میں چونکہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا چکا تھا اس لیے قطعاً اُن کی اس توجہ نے مجھ پر اثر نہ کیا۔

اُس رات میں چابیوں کے ساتھ پلنگ میں ریٹائر ہو چکا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں خیالوں میں پانچ فٹ گیارہ انچ کا خوبرو نوجوان تھا۔ میں نے پہلے لمبی چابی سے ایک طاق کھولا۔ پھر دیوار میں دوسری چابی لگا کر الماری کھولی۔ اس کے بعد موتیا کی کلی ایسی چابی فٹ کر کے خفیہ دراز کھول کر وہ ننھی سی پستول نکالی اور ابھی گیلری تک پہنچا ہی تھا کہ میری بیوی ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفید لفافہ لیے آگئی:

"اور اب بھی آپ کہیں گے کہ معاملہ کچھ نہ تھا ـــــ؟"

میں اپنے حواس مجتمع نہ کر سکا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ قرآن کی جھوٹی قسم بھی کھا سکتے ہیں!"

"لیکن ہوا کیا ہے آخر ـــ؟"

"اس عمر میں معصومیت کا ڈرامہ کچھ ایسا اچھا نہیں آپ پر۔"

"کچھ سمجھاؤ بھی"

"یہ خط تو آپ جیسے پہچانتے ہی نہیں!"

"خط ـــ؟"

"لیجیے اور دیکھیے۔ میں ایسی تنگ نظر نہیں ہوں کہ ایسی باتوں کا بُرا مان جاؤں۔ آپ شوق سے ہر جگہ دل لگائیے ـــــ سو جگہ خط لکھیے ـــــ اور ان چابیوں کو سینے سے لگا کر

رکھیے جن میں یہ خط مقفل ہوتے ہیں لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ نے مجھ سے سچ نہیں کہا۔ مجھے اپنا خیر خواہ نہیں سمجھا۔ اپنا دوست نہیں جانا۔"

"کون کہتا ہے ـــــ؟"

"جوانی میں آپ سے جو کچھ بھی ہوا میں نے معاف کیا کیونکہ آپ نے ہمیشہ مجھ سے سچ کہا اور ہر بات مجھے بتائی لیکن اب آپ مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہیں ـــــ رازداری برتتے ہیں مجھ سے۔"

"کون کہتا ہے ـــــ؟"

"میں جانتی ہوں یہ کوٹ کہاں سے آیا ہے۔ میں جانتی ہوں یہ چابیاں کون سے تالے کی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اُس تالے کو کھول کر کس کے خط رکھے جاتے ہیں ـــــ خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے تو پہچانا ہے۔ آپ جس سے چاہے دل لگائیے لیکن خدا کے لیے جھوٹ تو نہ بولیے مجھ سے ـــ"

میری بیوی یوں ہی بولتی ہوئی باہر چلی گئی۔

سفید منا سا خط میرے پلنگ پر پڑا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے کھولا ـــــ مس حیدری نے لکھا تھا:

"آپ اس قدر بدل گئے ہیں۔ آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے ـــــ میں کئی بار آپ سے ملنے آئی لیکن آپ کی چابیوں اور کوٹ کے علاوہ اور کسی سے کچھ نہیں کہہ سکی۔ یہ کوٹ اور چابیاں میری راز داں ہیں۔ کاش! آپ کو یہ وہ سب کچھ بتا سکیں جو میں انھیں بتا چکی ہوں۔

ـــــ مس حیدری"

میرے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

تین سال ہو گئے ہیں میں نے وہ کوٹ اور چابیاں دونوں بیوی کی تحویل میں دے

دی ہیں لیکن اس بھلی لوگ کو آج تک یقین نہیں آسکا کہ جو راز مس حیدری نے کوٹ اور چابیوں کو بتایا تھا میں اسے نہیں جانتا۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی عورت نے سارے محلّے میں مجھے 'بڈّھے ٹھرکی' کا خطاب دلا دیا ہے جس نے مجھے نامرد ہونے کے الزام سے بچایا تھا — لیکن یہ تو تیس سال پہلے کی بات ہے!

بھوا

بھوا کے جانے کے تیسرے دن بھیا کی نئی نویلی دلہن بھی میکے چلی گئی۔

اب حقیقت تو خدا کو یا بھوا کو بہتر معلوم ہے لیکن اس کے اچانک چلے جانے سے ہمارے گھر میں عجب قسم کی خاموشی چھاگئی ہے۔ بھیّا اپنا فٹ بھر لمبا سگار لے کر لان میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ حتّٰی کہ اُن کے منہ سے مُنّے کے متعلق بھی کوئی بات نہیں نکلتی — اب آپ ہی بتائیے پہلے بھی کبھی یوں ہوا تھا؟

بھوا کے جانے سے پہلے تو بھیا چھین چھین کر مُنّے کو بھوا سے لے جاتے تھے کبھی اس کے لیے ہوائی جہاز بناتے۔ کبھی اس سے سرکس کراتے — تھک کر اُن کی گود میں لیٹ جاتا تو گالیوں کی مشق کراتے لیکن اب تو وہ کرسی میں دھنسے یوں بے نیاز ہو گئے ہیں گویا مُنّا اس گھر کا نہیں ہمسائے کا بچہ ہے جو بھول کر یہاں آگیا ہے —؟

مُنّا اُن کی کرسی سے لگ کر آہستہ سے کہتا ہے:

'جھہ پاپا — جھا چا چا'

لیکن مسکرا کر دیکھنے کے علاوہ اُن کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی اور میں سوچتی ہوں کہ

آخر بات کیا ہے ـــ دلہن میکے سے آتی کیوں نہیں؟ ـــ بوا کو مہر دین کیوں نہیں ڈھونڈ لاتا؟

بوا تھی تو گھر آنگن سبھی سجا ہوا تھا ـــ کانگڑے کے یہ مہاجر ہمارے گھر میں نوکر تھے۔ بوا منّے کو کھلاتی تھی اور کپڑے وغیرہ دھوتی تھی۔ مہر دین باورچی کا کام کرتا تھا اور دونوں کی خوب گزران ہوتی تھی ـــ بوا کی بوڑھی ساس جس کا چہرہ جھریوں سے اٹا ہوا تھا سارا دن نوکروں کے کوارٹروں کے سامنے نیم کے پیڑ تلے گڑگڑی پیتی اور بوا کے کام میں کیڑے نکالتی تھی۔

یہ بھیا کی برات سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے، بوا پچھلے آنگن میں تار پر دھلے ہوئے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر ڈال رہی تھی۔ میں منّے کے چھوٹے سے سرخ پاجامے میں ازار بند ڈال رہی تھی۔ ہر بار جب بوا کپڑا نچوڑتی تو منہ کو بھی آستین سے پونچھ لیتی۔ کچھ دیر تو مجھے خیال نہ آیا۔ پھر میں اس کے قریب چلی گئی۔

بوا رو رہی تھی۔

اس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور ناک کی موٹی سی تیلی پر ایک جھلملاتا آنسو پھسل رہا تھا۔

میں قریب پہنچی تو بوا اور بھی تندہی سے کام میں مشغول ہو گئی۔

"بوا۔ ہوا کیا ہے آخر؟"

"بی بی جی! اب کیہو تک ان کی باتاں برداشت کروں جی؟"

"کن کی باتاں؟" میں نے پوچھا۔

"مہر دین اور اس کی ماں کی ـــ"

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی ـــ"

"اب جی مہرا کھوے جی کہ جاتک کیوں نہ ہوا ابھے تک ہاں ـــ"

یہ کہہ کر بوا پھپک پھپک رونے لگی۔

میں اسے اس وقت تک تسلی دیتی رہی جب تک اماں نے مجھے اندر نہ بلا لیا۔

بوا کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے لیکن روپ وان عورت ابھی تک بچے کو ترس رہی تھی۔ منّے کو سارا دن لیے پھرتی اور میرا خیال ہے اگر میں اسے اجازت دیتی تو شاید وہ منّے کو رات بھی اپنے ساتھ ہی سُلاتی۔

کچھ تو بوا کی بدنصیبی تھی اور کچھ مہر دین اور اس کی ماں نے اس کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ جب کبھی وہ اکیلی بیٹھی مجھے نظر آتی اس کی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو ہوتے۔

برات کی واپسی پر سب تھک ہار کر سو چکے تھے۔ صرف دوسری منزل میں دولہا دولہن کے کمرے میں بتی روشن تھی۔ مجھے نیند نہ آ رہی تھی۔ خدا جانے کیوں میرا دل سرِ شام سے گھبرایا ہوا تھا۔ بھیا نے دلہن کو پہلی مرتبہ آج ہی دیکھا تھا اور دلہن کی صورت واجبی اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ بے چاری جب خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی تو بھی لگتا تھا کہ جیسے مسکرائے جا رہی ہے۔ ننھا سا ایک دانت نچلے لب پر کچھ اس انداز سے ٹکا ہوا تھا کہ اس کی ساری سنجیدگی کو چاٹے لیے جاتا تھا۔

پھر اوپر والی منزل سے کوئی بھاگ کر نیچے اترا تو میں منّے کو سوتا چھوڑ کر برآمدے کی طرف چلی۔ بھیا کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ ڈریسنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھنے میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا:

"تم لوگوں نے میرے لیے اچھا نگینہ تلاش کیا ـــ"

میرا دل سینے میں زور زور سے اچھلنے لگا:

"کیوں کیا بات ہوئی ـــ"

"باجی! کچھ دیکھ تو لیا ہوتا ـــ تمہیں اپنے دیور پہ ذرا بھی ترس نہ آیا۔"

بھیا کی آنکھوں میں کچھ ایسے آنسو تھے اور آواز میں ایسی دکھ بھری تڑپ تھی کہ

میرا اپنا جی دُکھ گیا — لیکن جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اب واویلا کرنے یا گلہ کرنے سے کچھ ہاتھ نہ آ سکتا تھا۔

میں نے منت سماجت کر کے بھیا کو اوپر بھیجا اور جی ہی جی میں دعائیں مانگنے لگی کہ یا اللہ! بھیا دلہن کی طبیعت کے اسیر ہو جائیں — بھیا اور دلہن کی یوں بنے کہ سارا گھر ان سے جلے — لیکن صبح کی اذان ہو گئی اور میری آنکھ نہ لگی۔

صبح گجر دم جب بوا منّے کے لیے دودھ کی بوتل لائی تو اس نے جھک کر میرے کان میں کہا:

"بی بی! بھیا تو لان میں گھوم رہے ہیں — کیا دلہن من کو نہیں لگی اُن کے؟"

یہ اس روز کا ذکر ہے جب اماں نے پہلے دن دلہن کا قدم بھاری جان کر سارے میں مٹھائی بانٹی تھی — ہم سب دلہن سے ہنسی مذاق کر رہے تھے اور وہ پلنگ پر بیٹھی کبھی بھیا کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی اپنے پیروں کی طرف۔

پھر سرونٹس کوارٹرز کی طرف سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اور اماں بھاگی بھاگی ادھر کو لپکیں۔ نیم کے درخت کے نیچے مہر دین کی ماں گڑگڑی لیے بیٹھی تھی اور مہر دین کے ہاتھ میں بجھی ہوئی چھوٹی سی لکڑی تھی اور وہ بڑھ بڑھ کر بوا کو پیٹ رہا تھا۔

میں نے مہر دین کی بس ایک ہی بات سنی اور پھر وہ ہمیں دیکھ کر اپنے کمرے میں جا چھپا وہ کہہ رہا تھا:

"دیکھتی نہیں۔ دو مہینے آئے کو نہیں ہوئے اور دلہن امید سے بھی ہو گئی۔ تجھ ایسی کوکھ جلی سے میں کب تک نباہ کروں گا — جا یہاں سے جا —"

اسی رات خدا جانے بوا کہاں چلی گئی؟

پولیس میں رپٹ لکھوائی۔ مہر دین کے تمام رشتے داروں میں تلاش کیا لیکن

بوا کا سراغ نہ ملا۔

اور پھر بوا کے جانے کے تیسرے دن اچانک دلہن بیگم نے ٹانگہ منگوایا اور اپنے میکے رخصت ہو گئیں۔

میں نے بھیا سے پوچھا تو وہ بولے:

"تم نے بوا کو دیکھا تھا؟ — اتنی خوبصورت عورت مہر دین جیسا نکال سکتا ہے تو میں ہی ایسا پاگل رہ گیا ہوں کہ تمہاری دلہن کے ساتھ گزارہ کرتا رہتا۔"

میں نے جھنجھلا کر کہا: "بھیا دیکھتے نہیں اللہ نے دلہن پر کیسی رحمت کی ہے"۔

بھیا چبا چبا کر بولے:

"جی ہاں — ایک ان ہی کو اس رحمت کی ضرورت رہ گئی تھی! — پہلے جو ماشاءاللہ بہت خوبصورت تھیں اب اور بھی چار چاند لگ جائیں گے"۔

"بھیا یہ کفرانِ نعمت ہے۔ توبہ توبہ ڈرو اس کے قہر سے"۔

"قہر تو جی اس کا مجھ پر نازل ہُوا ہی ہے — پہلے کم از کم اپنے جامے میں تو رہتی تھی — اب تو وہ بھی اترانے لگی تھیں — ایک اتراتی ہوئی بدصورت عورت تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی"۔

"بھیا — !" میں نے چلّا کر کہا۔

"پہلے اس کی چاکری ہی کیا کم تھی جو اب اس کے بچوں کو بھی پالتا پھروں — ٹھیک ہے اُسے وہیں رہنے دو جی — !"

میں خاموش ہو گئی۔

مجھے یوں لگا جیسے بوا اور دلہن دونوں ہاتھ پکڑے اور واپس نہ آنے کی قسم کھا کر دھرتی تلے اُتر گئی ہوں!

———

پہلا پتھر

زارا کی نگاہیں ٹیلی فون پر جمی تھیں لیکن وہ بڑی تیزی سے عصمت سے باتیں کیے جا رہی تھی:

"دیکھو عصمت! بس زندگی میں غیرت ہی ایک چیز ہوتی ہے۔ اگر ہمیشہ تم ہی اس سے ملنے جاؤ گی تو وہ تمہیں اپنی جوتی برابر بھی اہمیت نہیں دے گا۔"

"لیکن میں کب کہتی ہوں کہ وہ مجھے اہمیت دیتا ہے!" عصمت نے کیچوے کی طرح بل کھا کر کہا۔

زارا کی نگاہیں پھر ٹیلی فون کا طواف کر گئیں اور اس نے گزشتہ بحث کی عظمت کو بنیاد بنا کر مشورہ دیا:

"اپنا دل ٹٹول لو عصمت! ایک طرف عاقل بھائی ہیں۔ جانتی ہو ان سے اچھا شوہر والدین تلاش کر کے بھی نہیں پہنچا سکتے۔"

"لیکن میرا دل! میرا دل کوئی چیز نہیں؟"

زارا کو لگا فون کی گھنٹی اندر ہی اندر بج رہی ہے اور پھر اس کی آواز کہیں دب کر رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ سوات کا لکیر دار سرخ پردہ اس کے سر سے بڑے زور سے

ٹکرایا اور پھر ڈنڈے سمیت مخملیں دیوان پر آ گرا۔ اتنی سنجیدہ گفتگو میں کامیڈی پیدا ہو گئی۔ زارا نے ہنس کر کہا:

"تمہارا دل اسی پردے کی طرح بلندیوں سے گرے گا۔ دیکھ لینا۔"

"پھر اگر گرتا ہے تو گرنے دو۔ شاید پھر اسے عقل آ جائے گی۔"

عصمت نے اپنی کتابیں اٹھائیں۔ سر پر بد دلی سے دوپٹہ اوڑھا۔ پاؤں میں سلیپر ٹھنسائے اور بغیر مطلع کیے برآمدے تک پہنچ گئی۔ زارا نے فون کی طرف دیکھا کمبخت اس کی گھنٹی شاید خراب تھی۔

پھر وہ بھی دروازہ کھول کر عصمت کے پیچھے برآمدے میں چلی گئی لیکن عصمت بھاری قدم دھرتی پھاٹک تک نکل گئی تھی۔ زارا نے ہاتھ ہلایا۔ عصمت نے جواب میں کتابوں والا ہاتھ ہوا میں لہرا دیا۔ بچے ابھی تک سکول سے نہیں آئے تھے۔

گھر میں کتنی خاموشی تھی۔ زارا ستون کے ساتھ کمر لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اوپر ستون اور چھت کے درمیان چھوٹے سے موکھے میں چڑیا اور چڑا گھر بنانے کے مشورے کر رہے تھے۔ دو تنکے ساتھ تھے جنہیں وہ اس چھوٹی سی جگہ میں جماتے، ادھیڑتے اور پھر جماتے تھے۔ چڑے میاں کا مزاج ذرا تند تھا وہ چڑیا کی ہر ہر سکیم فیل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس پر اگر ذرا سا چڑیا بھی خم کھاتی تو دو تین چونچیں دھاتس دیتے۔

زارا بڑی دیر تک کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

فون کی گھنٹی میں ذرا جنبش نہ ہوئی۔

اس نے اپنے جی میں کوئی ہزارویں مرتبہ کہا: "ہونہہ۔ نہیں کرتا فون تو نہ سہی۔ میں کوئی عصمت ہوں"۔

لیکن گھر کتنا خاموش تھا۔ اماں نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں اور جی میں اس اودبلاؤ کی سی کھدبد ہو رہی تھی جسے پانی کی تہ سے پلیسہ نکالنے سے روک رکھا ہو۔ ابا تو خیر کبھی تین بجے

آتے ہی نہیں لیکن اماں کیوں غائب ہیں بھلا؟ کالج سے گھر واپس آؤ اور اماں نہ ملیں تو دل ویران ہو جاتا ہے۔

زارا نے اپنے وجود کو دیوان پر ڈال دیا اور سوچنے لگی ہفتہ کی رات کے متعلق — ہفتہ کی رات ویسے بھی اپنے اندر ایک رومان کی دنیا رکھتی ہے لیکن اس ہفتہ کا خواب اس کے ساتھ ابھی تک چل رہا تھا۔

"یہ ہیں فلائٹ لیفٹیننٹ زبیر احمد"۔

"اور یہ ہے زارا — روس کی نہیں اپنے پاکستان کی"۔

زبیر احمد نے لمحہ بھر کے لیے اسے دیکھا۔ بس لمحہ بھر کے لیے اور پھر وہی امریکن رسالہ دیکھنے لگا جس کے باہر کسی نیم برہنہ عورت کی تصویر تھی۔

"بھائی زبیر! ہم اسے جینا لولو برجیڈا کہتے ہیں"۔

"ہیں —؟" زبیر نے ایک نظر اسے سر سے پیر تک دیکھا — توبہ! کوئی جُون کی دھوپ میں کھڑا رہ سکتا ہے بھلا؟ زارا خاموشی سے ریڈیو گرام کی طرف پلٹ گئی۔

زبیر ساری شام وہی امریکن رسالہ پڑھتا رہا اور سعیدہ اپنے بھائی کی تعریفیں کرتی رہی۔ زارا ان تعریفوں سے چڑ گئی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ امریکن رسالے کے پیچھے سے کبھی کبھی دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں ابھرتی ہیں اور اس کا طواف کر کے لوٹ جاتی ہیں۔ گپ چپ آہستہ آہستہ!

جب وہ کھانے کے بعد اپنے گھر جانے والے تھے اور اماں، زرّیں، شبانہ اور جاوید کار میں چڑھ گئے تھے تو وہ اپنا پرس لینے دوبارہ اندر آئی تھی یا خدا جانے پرس نہیں وہ کسی اور کی تلاش میں آ نکلی تھی۔ زبیر اسی جگہ بیٹھا تھا جہاں اس کا پرس ریکارڈوں کے قریب دھرا تھا۔ پرس کے ساتھ بندھی ہوئی لمبی زنجیر اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے کھولنے ہی والا تھا جب زارا اندر پہنچی — بغیر آستینوں کی قمیص پہنے، لمبی ایڑی پر وزن جمائے، اس نے

سب سے پہلے اپنا عکس شیشے میں دیکھا۔ اس کے بعد اس کی نظر زبیر احمد پر پڑی۔ وہ یقیناً ہر طرح سے اس سے گھٹیا تھا۔

"میرا پرس!" زارا نے آہستہ سے کہا۔

زبیر نے پرس اپنی پشت کی جانب کر لیا۔ پتلی پتلی راجپوتی مونچھوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔

"میرا پرس دے دیجیے پلیز"۔

"تاوان ادا کیجیے بھول جانے کا"۔

باہر ابا نے ہارن بجایا۔ نئی گاڑی کا نیا ہارن۔

"دے دیجیے پلیز — ابا بلا رہے ہیں"۔

"لے لیجیے اگر طاقت ہے ورنہ ہم تو ہر ایک چیز کو ہوا میں اچھال دینے کے عادی ہیں"۔

"پلیز —!"

زبیر نے نگاہیں فرش پر جما کر کہا۔ "اب یہ کیسے ثابت ہو کہ یہ پرس آپ کا ہے!"

باہر پھر ہارن بجا — تلخی کے ساتھ۔ بڑی طوالت سے۔

"دیجیے نا —"

"فون کیجیے گا نا —؟"

"آپ کر لیجیے گا خود ہی —" زارا نے پرس کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"نہیں بھئی۔ تاوان تو آپ کو ادا کرنا ہے"۔

ہارن اس بار بجتا ہی گیا۔

"اچھا لے لیجیے — لیکن فون کیجیے گا"۔

"اگر آپ کر دیں گے تو میں جواب دے دوں گی۔"

پرس لے کر وہ پچھلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ زینب نے اس سے کچھ پوچھا۔ شبانہ نے چڑ کر کچھ کہا لیکن وہ کھڑکی سے پرے دیکھتی رہی۔ درختوں سے گھری سایہ دار سڑک اسے آج نئی سی لگی۔ کار کے شیشے پر رابچوتی مونچھوں کا عکس خدا جانے اسے کیوں نظر آ تا رہا۔

پورے تین دن جا چکے تھے اور سعیدہ کے گھر سے ایک بار بھی فون نہ آیا تھا۔ ہر بار جب فون کی گھنٹی بجتی تو وہ ہر کام چھوڑ کر اسے اٹھانے جاتی۔ آخری بار جب ابا کے دفتر سے ان کے چپراسی نے فون کیا تو اس نے بغیر سلام کا جواب دیے ہی چونگا ٹیک دیا اور خود بازو پر سر رکھ کر رونے لگی۔

عصمت جا چکی تھی۔ یہاں کا بہانہ بنا کر وہ سیدھی ریلوے سٹیشن جائے گی اپنے مختار سے ملنے ـــــ ریلوے سٹیشن ملاقات کی اچھی جگہ ہے۔ انگریزی گانے کی طرح ڈکارتی ٹرینیں واں واں کرتی پلیٹ فارموں پر آتی ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور اس بھیڑ میں عصمت پلیٹ فارم کا ٹکٹ خریدے کالج کی کتابیں ہاتھ میں لیے سیڑھیاں چڑھتی ہے۔ ابھی پرسوں تو وہ کہہ رہی تھی کہ اتوار کے دن چونکہ اب صبح کے وقت ہوتا ہے وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا ہے اور اسی لیے اب اتوار کے دن وہ صبح کو ریلوے سٹیشن نہیں جاتی۔

شاید فون کی گھنٹی بجی؟

اس نے اپنی لمبی ٹانگیں سمیٹ لیں اور اس کارواں رواں گھنٹی کے ارتعاش پر لرزنے لگا۔ جس طرح کبھی آسمان پر شور مچاتا ہوائی جہاز گزرتا ہے تو مکانوں کی کھڑکیوں میں شیشے جلترنگ سا بجانے لگتے ہیں لیکن دوسرے لمحے زارا اوندھی لیٹ گئی۔ فون کی گھنٹی نہ تھی اندر کھانے کے کمرے میں ٹائم پیس غلط الارم بجا رہا تھا۔ گھر کتنا سنسان تھا۔ وہ اٹھ کر فون کے قریب سرخ بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظروں میں عصمت گھوم رہی تھی۔

عصمت کی دیدہ دلیری بھی خوب ہے۔ کیسے پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر وہ سیڑھیاں

چڑھتی ہے اور پھر پل پر اس وقت تک کھڑی رہتی ہے جب تک نیچے سے مختار برآمد نہیں ہوتا۔ کئی بار تو اسے پون گھنٹہ تک راہ دیکھنا پڑتی ہے۔ ٹرینوں میں سے ایک خلقت نکلتی ہے لیکن اس ہجوم میں مختار نہیں ہوتا۔ پھر گھر لوٹنے کی بھی جلدی ہوتی ہے ـــــ لیکن ایک منٹ کرتے کرتے وہ پون گھنٹہ کھڑی رہتی ہے اور پاؤں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں گاڑیوں کے دھوئیں سے جی مالش کرنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ کسی انجن تلے کود کر جان دے دی جائے۔

لیکن ہمیشہ ایسے لمحوں میں کہیں سے مختار آ جاتا ہے اور پھر وہ دونوں رش سے ہٹ کر ایک معمولی سے بنچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ریل کی متوازی پٹڑیوں کی طرح باتیں بھی لامتناہی ہوتی ہیں ـــــ اور ہر بار ملنے کے باوجود نقطۂ اتصال پیدا نہیں ہوتا۔

گھر میں کتنی خاموشی تھی۔

باہر چڑیا اور چڑے کی جوڑی چونچوں میں پھونس اٹھائے ستون کے موکھے میں گھر بنانے کے جتن کر رہے تھے۔ باورچی خانے میں نلکے کے پانی کا دھارا پوری آب و تاب سے بہہ رہا تھا اور ڈائننگ ہال سے برتن اٹھانے اور لگانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ زارا نے ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھ دیں اور آخری بار سوچا:

"اور اگر میں زبیر کو فون کروں تو؟"

یہ خیال اس کے ذہن میں چکر لگاتا چمگادڑ کی طرح لٹک کر رہ گیا۔

اس نے فون کے چونگے پر ہاتھ دھرا اور پھر اٹھا لیا۔ اسے یوں لگا کہیں سے عصمت نے دیکھ لیا ہے اور وہ پلیٹ فارم کے اوپر سے رومال ہلا کر کہہ رہی ہے:

"زارا! بسٹ آف لک ـــ لیکن ـــ دیکھنا یہ خارزار ہے۔ یہاں پتہ مارنا پڑتا ہے پتہ!"

چونگا اٹھانے اور رکھنے میں ابھی جانے کتنی دیر لگ جاتی اگر اسے خیال نہ آتا کہ ابھی

شبانہ، زریں اور جاوید سکول سے آجائیں گے اور پھر ـــــ پھر خدا جانے کیا ہو؟
اس نے سعیدہ کے گھر کا نمبر ملایا اور جی ہی جی میں دعا مانگی کہ کاش سعیدہ چونگا اٹھا کر کہے:

"جینا لولو بر جیڈا میرے بھائی نوکل چلے گئے رسالپور۔"

جب دوسری طرف سے آواز آئی تو فون زارا کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔
"یس ـــ"

"جی سعیدہ گھر پہ ہے؟" اس نے پوچھا۔
"جی۔ کون صاحبہ ہیں؟"

"جی میں زارا ہوں۔"

ہیلو ـــ! جیناآپ کو اپنا وعدہ یاد رہا پھر ـــ؟"
"کیسا وعدہ ـــــ؟" وہ چونک کر بولی۔

"تاوان بھرنے کا!"
"جی کیسا تاوان ـــــ آپ کون ہیں؟"

اب دوسری طرف سے قہقہہ بلند ہوا ـــــ بھرپور قہقہہ، طیارے کی گھن گرج لیے۔
"یعنی آپ مجھے یقین دلانا چاہتی ہیں کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"
قہقہہ ٹھکورے لیتا ہوا لینڈ کر گیا۔

"اچھا زبیر صاحب ہیں ـــ!"
"جی ہاں زارا صاحبہ! اور دیکھیے آپ کے پرس میں آپ کی ایک ذاتی شے نہیں ہے؟ وہ میرے پاس امانت رکھی ہے۔ لیجائیے گا کسی روز۔"
"کون سی چیز ہے۔"
"اب دیکھیے مالِ غنیمت کی فہرست تو دشمن کو نہیں دکھائی جا سکتی نا؟"

وہ روہانسی ہو گئی۔ دُور سے ابا کے ہارن کی آواز آ رہی تھی۔
"کمبخت اتنی دیر تک تو آئے نہیں اور اب آ گئے ہیں جب ـــــ"
"آپ آئیں گی تو مل جائے گی البتہ اتنے دنوں سے میں استعمال کر رہا ہوں۔"

"بتا دیجیے نا آپ؟"
"بتا دوں گا لیکن آنے پر۔"
"میں نہیں آ سکتی۔"

دوسری جانب سے قہقہہ پھر اڑنے لگا:
"معاف کیجیے گا آپ کا باپ بھی آئے گا۔"
اس نے جلدی سے فون چونگے پہ دھر دیا۔
واقعی اس کا باپ پورچ تک آ چکا تھا۔
رات بہت جا چکی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ غسلخانے میں زیرو کا بلب روشن تھا اور اس کی روشنی درز میں سے اندر آ رہی تھی۔ شبانہ کی ایک چوٹی تکیے پہ سانپ کی طرح پڑی تھی اور اس کا سر اندر رضائی میں غائب تھا۔

وہ کہنی کے بل ہو گئی۔ اسے زبیر پر کتنا غصّہ آ رہا تھا۔ اگر اس وقت وہ سامنے ہوتا تو زارا اپنے پورے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پہ مارتی لیکن اس کے جی نے پوچھا:
"زارا بی بی! تم نے یہ چانٹا اس وقت کیوں نہ رسید کیا جب۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن تب تو وہ دونوں اکیلے تھے اور ان سے بیس فٹ کے فاصلے پر سعیدہ فرائنگ پین میں کباب تل رہی تھی۔ آملیٹ اور کبابوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ زبیر اس کی کرسی پہ دونوں ہاتھ رکھے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ ساری طرف اندھیرا تھا اور ہری لان میں سے سردی اوپر کی طرف اٹھ رہی تھی۔ پام کے گملے یوں نظر آ رہے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے بچے دم سادھے

سیڑھیوں پر بیٹھے ہوں اور ان بچوں کی آڑ میں وہ کرسی پر پیچھے کی طرف جھکتی جا رہی تھی۔

"دیکھو زارا! دائیں اور بائیں جانب ایک ایک الوداعی بوسہ — اور بس!"

"ارے نیک بخت! تجھے چومنا ہی ہے تو خود چوم لے۔" اس نے جی میں کہا — لیکن وہ جھکا آ رہا تھا اور بیس فٹ کے فاصلے پر سعیدہ باورچی خانے میں کباب تل رہی تھی۔ وہی کباب جو سینما سے واپسی پر وہ لائے تھے۔

زبیر کی راجپوتی مونچھیں اس کے بہت قریب ہو گئیں:

"مجھے چوم لو ورنہ پچھتاؤ گی — بہت!"

زارا نے جلدی سے اس کے گالوں کو دونوں طرف چوم لیا اور دھکا دیتی ہوئی کھڑی ہو گئی جیسے کوئی بلا ٹالی ہو۔ اس طریقے سے استقبال کے وقت اطالوی لوگ ایک دوسرے کو چومتے ہیں — لیکن اب رات کے اندھیرے میں جب اس واقعہ کو چار گھنٹے ہو چکے تھے اسے اپنی اس حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ کبھی وہ سونے والی گولیاں ابا کے کمرے میں سے چرا کر لانے کے متعلق سوچتی، کبھی سوچتی کہ تیسری منزل سے کود جاؤں اور اس جھگڑے سے نجات پاؤں جس میں خواہ مخواہ مجھے محبت کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے — خواہ مخواہ ہاں۔

ابھی چند دن ہوئے جب وہ سعیدہ کے ہاں گئی تھی تو زبیر نے اسے سر دبانے پر مجبور کر دیا تھا — کوئی کھیل ہے — کوئی مذاق ہے ہاں! وہ چوری چوری اٹھی اور کاغذ پنسل اٹھا کر غسلخانے کی طرف چل دی۔ زرّیں نے ایک کروٹ لی اور غسلخانے کی طرف پیٹھ موڑ لی۔ اندر سفید کموڈ کا ڈھکنا بند کر کے وہ ڈھکنے پر بیٹھ گئی۔ کتنا غیر رومانی انداز تھا پہلا عشقیہ خط لکھنے کا — کس قدر اَن رومانٹک!

اس نے سفید سنک کے اوپر لگے ہوئے شیشے میں جھانکا۔ وہ اس وقت چڑی ہوئی بلّی لگ رہی تھی۔ جلدی جلدی اس نے خط لکھنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ کئی صفحے بھر گئے۔ یہ خط اس نے پھاڑ ڈالا لیکن سارے غسلخانے میں ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جس میں وہ

یہ ٹکڑے پھینک سکتی۔ اس نے یہ ٹکڑے کھڑکی کھول کر باہر پھینک دیے۔ دوسرے لمحے اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر کسی نے صبح یہ پرزے اٹھا لیے تو؟

لیکن اب تو کاغذ کے ٹکڑے باہر تھے اور آہستہ آہستہ ہوا بھی چل رہی تھی۔ وہ دوبارہ کموڈ پر بیٹھ گئی اور اس بار سہ حرفی خط لکھ کر لفافہ میں بند کر دیا۔

سنیے زبیر صاحب!

آپ خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ آیندہ آپ مجھ سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں ورنہ میں ابا سے آپ کی شکایت کر دوں گی۔

"زارا"

اس کے خط کا کوئی جواب نہ آیا۔

عصمت اسی طرح پلیٹ فارم پر جاتی تھی۔ اور کوارٹرلی امتحان میں فیل ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی زردی چھائی رہتی۔ کئی راتوں کی بے خوابی نے سارا لہو چوس لیا تھا۔ اب اسے کئی بار دو دو گھنٹے پل پر کھڑا رہنا پڑتا لیکن مختار نہ آتا۔

زارا اسے سمجھاتی کہ "ہوش کے ناخن لے۔ جو دولہا پہلے ایسے نخرے دکھا رہا ہے وہ بھلا بعد میں کب جینے دے گا۔ ساری عمر تیری طرف پیٹھ کر کے سوئے گا اور تو اس کی پیٹھ سے لگی اپنے مقدر کو روتی رہے گی۔"

اور جب یہ مشورہ دے کر وہ کالج سے لوٹتی تو نادانستہ طور پر اس کے قدم پوسٹ بکس کے قریب آہستہ ہو کر رک جاتے۔ وہ لکڑی کا پٹ کھول کر دیکھتی۔ ننھی سی مردار چھپکلی اچک کر ڈبے کی چھت سے لگ جاتی اور بس! — پھر آہستہ آہستہ برآمدے تک آتی — سیڑھیوں پر کتابیں رکھ کر وہ اور ستون کے موکھے کی طرف دیکھتی — "کیا گھر بسایا ہے چڑے اور چڑیا نے۔"

چڑے میاں اب بھی اِتراتے اور چڑیا کو بچوں کی تربیت کے سو سو اصول سمجھاتے۔ لیکن ـــ لیکن خط نہیں آتا رسالپور سے۔ آخر کیوں؟

اس کے چہرے پر بھی زردی نے دھاوا بول دیا تھا اور ابا اسے ٹیکے لگوانے لگے تھے۔ کوئی کہتا لہو کی کمی پیدا ہوگئی ہے۔ کوئی کہتا پڑھتی زیادہ ہے۔ اماں نے اسے شبانہ اور زرّیں کے کمرے سے نکال کر لائبریری کے ساتھ والا کمرہ عطا کر دیا تھا ـــ لیکن وہ سوچتی رہتی کہ آخر خط کیوں نہیں آتا۔ کیا ایسا ہی بے وفا نکلا یا صرف فلرٹ کر رہا تھا، فلرٹ۔

ہولے ہولے تکیے بھیگتے۔ رومال بھیگتے اور وہ بے خوابی کے مارے اِدھر سے اُدھر کروٹیں بدلتی رہ جاتی۔

'کون؟'

'سعیدہ ہوں زارا۔'

'کہو کیا حال ہے؟'

'زارا! میں آج کالج نہیں جاؤں گی، بھائی زبیر آئے ہیں۔'

'کون؟' حالانکہ اس کے انگ انگ نے یہ نام سُن لیا تھا۔

'ہائے اللہ آہستہ بولو ـــ کوئی ٹرنک کال ہے کیا۔ بھائی زبیر آئے ہیں' ـــ سعیدہ دوسری طرف سے بولی: 'میں کالج نہیں جاؤں گی۔ اپنی طرف سے میری درخواست دے دینا۔'

'اچھا۔'

پھر وہ بھی کالج نہ گئی۔

سارا دن ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پڑھتی رہی۔ اماں نے اسے کھانے کے لیے بلایا۔ لیکن وہ نہ گئی۔ چڑیوں کا جوڑا اندر سے نظر آتا تھا اور فون کا چونگا دو قدم دُور تھا۔ سارا دن فون نہ آیا اور رات کو وہ بلا مقصد سعیدہ سے ملنے چلی گئی۔

گرم نیلی وردی میں سیاہ بوٹ پہنے وہ چھوٹے سے قد کا سانولا ...... نیولا سا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی شکل کتنی معمولی تھی۔ اس معمولی صورت پر تیکھی تیکھی راجپوتی مونچھیں بڑی سنجیدہ لگ رہی تھیں اور دائیں ہاتھ پر زیادہ سگریٹ نوشی سے گہرے زرد دھبے پڑے ہوئے تھے جو سانولے ہاتھ پر اور بھی بد نما لگتے تھے۔

زبیر نے اسے دیکھ کر چہرہ نہ اٹھایا۔

'ارے زبیر بھائی! جینا آئی ہے۔' سعیدہ نے اسے متوجہ کیا۔

'کون جینا؟' اس نے اخبار سے یوں لاپرواہی سے سر اٹھایا گویا سامنے اردلی کھڑا ہو۔

'ہائے زارا ـــ بھائی' سعیدہ بولی۔

'ہیلو ـــ کیا حال ہے آپ کا؟'

'ٹھیک ہوں جی' وہ منمنائی۔

لمحہ بھر کو اس نے زارا کی طرف دیکھا اور پھر سگریٹ پینے میں مصروف ہوگیا۔ اس کی بہنیں زرّیں اور شبانہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر گراؤنڈ میں کھیل رہی تھیں۔ اندر شام کا جھٹپٹا تھا۔ ریڈیوگرام، ایرانی قالین، چینی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے، بلوریں پھولدان، سب اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ ٹرالی پر چائے کے باسی برتن اب بے نور تھے۔ صرف چاندی کی کیتلی، دودھ دان اور چینی دان اس مدھم سی روشنی میں بھی پارے کی طرح دمک رہے تھے۔ وہ اسی طرح اخبار پڑھے جا رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی سر اٹھا کر نہ دیکھا اور زارا کو آئے پورے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

بڑی دیر کے بعد زارا نے آہستہ سے کہا:

'بتی جلا دوں؟'

'جلا لیجیے اگر آپ کو ضرورت ہو' جواب ملا۔

زارا نے بتی نہ جلائی۔

سعیدہ اپنے کمرے میں نماز پڑھنے گئی ہوئی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو وہ بھی نماز پڑھنے جا سکتی تھی لیکن ــــ خدا جانے وہ کیوں نہ گئی۔

پھر اس نے خود ہی پوچھا:

"آپ کو میرا خط مل گیا تھا؟"

"جی ــــ آپ کا خط؟ شیوڑ مل گیا تھا۔ بھلا رسالپور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ شیطان کی طرح مشہور ہوں صاحب!"

وہ پھر اخبار کے پیچھے غائب ہو گیا۔

اخبار نہ ہوا موئی ڈھال ہو گئی لڑائی کی۔

"اور آپ نے جواب نہیں دیا؟"

اس بار راجپوتی مونچھیں ذرا جنبش میں آئیں اور مسکراہٹ بن کر لبوں پر پھیل گئیں:

"آپ نے خود ہی لاتعلقی کا آرڈر دیا تھا ورنہ ہم نے پلروں کے لیے تو خط لکھنا بہترین پاس ٹائم ہے۔"

"پاس ٹائم؟" وہ اٹھ بیٹھی۔

زبیر پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

"آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں؟"

بڑی سادگی سے زبیر بولا۔ "جینا لولو برجیڈا۔"

"بہت خوب۔ سمجھتے رہیے۔"

وہ اٹھ کر چلی گئی لیکن زبیر نے اخبار پر سے نگاہ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔

عصمت کے چہرے پر اتنے سارے آنسوؤں کے دھبے تھے، بالکل جیسے اس کے روشندان پر مٹی اور بارش کے چھینٹوں سے نقشے بنے ہوئے تھے۔ اب آنسو خشک ہو چکے

تھے اور اس کی رندھی ہوئی آواز بھی نارمل ہو گئی تھی لیکن چہرے پر بڑے کرب کی کیفیت تھی۔ وہ کہتی گئی:

"میں نے مختار کے لیے کیا نہیں کیا زارا۔ اماں کی مار کھائی۔ ابا نے گولی مارنے کی دھمکی دی لیکن میں باز نہیں آئی۔ جب کبھی مجھے موقع ملا میں اسے ملنے گئی ــــ اور میں ہی بے غیرت تھی کہ ــــ کہ میں نے خود ہی اس سے کہا، مختار! اگر تم چاہو تو ــــ تو ہم دونوں کراچی چل دیں۔ یہاں سے، پلیٹ فارم سے چپکے سے روانہ ہو جائیں اور کسی کو ہمارا علم نہ ہو گا لیکن اسے میری پرواہ ہی کب تھی ــــ"

پھر ایک سسکی اس کے سینے کو چاٹتی نکلی ــــ کسی دھول بھری ویران راہ پر ہوا کا جھونکا۔

"میں نے مختار کی محبت میں ــــ ہائے ــــ اور کہنے لگا عاقل سے بیاہ کر لو۔ اسی میں ہماری بہتری ہے۔ خدا نے چاہا تو شادی کے بعد میں تم سے ملتا رہوں گا ــــ ذرا تم سوچو تو ــــ ہائے اللہ ــــ"

زارا نے تھرڈ ایئر کی کتابیں لان پر پٹک دیں اور عصمت کے چہرے سے اس کے ہاتھ اتارتے ہوئے کہا:

"چلو اچھا ہی ہوا ہے کہ ایسا بدبخت تمہارے پیچھے سے ہٹ گیا۔ ایسے شوہر سے بھلا کیا سکھ ملتا!"

"میں تو روتی ہوں کہ ــــ کہ ایسے آدمی کے لیے کتنی بے غیرت بنی ــــ توبہ!"

پہلے آنسوؤں کا دھارا تیزی سے بہا پھر سسکیوں کی شکل اختیار کی اور آخر میں بند بند ہچکیاں سی رہ گئیں۔

زارا نے فیصلہ کر لیا کہ اب زبیر کی صورت بھی نہ دیکھے گی۔

چڑیا کا ایک گنجا سا نازک بچہ فرش پر گر گیا تھا اور وہ اس کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔

زارا نے اس بچے کو اپنی ہتھیلی پر اٹھایا تو اسے عجب گدگدی سی محسوس ہوئی۔ بچہ فوراً اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ گھونسلے میں سے چار گنجے بچوں نے گردنیں نکالیں اور بڑے فراغت سے چوں چوں کرنے لگے۔ چڑیا اور چڑا اس تیزی سے نیچے کی طرف اترے کہ عین درمیان میں پہنچ کر ایک دوسرے سے بھڑے اور دور دور جا گرے۔ اب دق کے مریض سے مشابہ بچے کو اس نے پھر اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور میز پر چڑھ گئی۔ میز کے اوپر بازوؤں والی کرسی دھری۔ اسے دونوں طرف سے زریں اور شبانہ نے پکڑ رکھا تھا۔ وہ پیر تولتی اوپر چڑھی اور بچہ گھونسلے میں دھر کر اترنے لگی تو چڑیا اس کے کندھے پر آ بیٹھی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو ——— اندر فون کی گھنٹی متواتر بج رہی تھی۔ زریں فون اٹھانے کے لیے چلی تو وہ کرسی سے کود کر بولی:

"ٹھہرو! میرا فون ہے۔"

"ہیلو ——— !"

"جی میں ———"

"ہیلو میں زبیر ہوں۔"

"کب آئے آپ؟"

"زبیر اور موت کا کچھ پتہ نہیں۔ جب چاہیں آ سکتے ہیں۔"

"اور خیریت ہے؟"

"ٹھیک ہوں ——— تم کب ملوگی؟"

"ناممکن ہے ——— یہاں سے کالج اور کالج سے گھر۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"تین بجے کالج کے گیٹ پہ میری موٹر سائیکل ہوگی۔"

"ناممکن ہے۔ میرے ساتھ سعیدہ بھی باہر نکلتی ہے۔" اس کی نظریں باہر جمی تھیں۔ جہاں اس کی بہنیں کرسی پہ چڑھی گھونسلہ دیکھ رہی تھیں۔

"تم پندرہ منٹ پہلے باہر نکلنا ——— بس!"

"سنیے تو ———"

"میں کچھ نہیں سن سکتا۔" آواز آئی۔

"ذرا ———"

اُدھر سے فون بند ہو گیا۔

زارا کو محسوس ہوا وہ اپنے گھونسلے سے نیچے گر گئی ہے اور اس کے ابا اور امی اِدھر اُدھر پریشان ڈول رہے ہیں۔

موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اسے محسوس ہوا وہ ہوا کے دوش پر اڑ رہی ہے۔ اپنا باغیرت حصہ وہ پھاٹک پر ہی چھوڑ آئی تھی اور اب اس کا دایاں گال کھردری وردی کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ وہ نہر کی سڑک کے ساتھ بڑی رفتار سے رواں ہوئے۔

جاتی سردیوں کی خنکی فضا میں اتر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو نہر کا پانی ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ آگے چل کر زبیر نے موٹر سائیکل اچانک روک لی اور آگے بڑھ کر اسے اتار لیا۔ سڑک سنسان تھی لیکن زارا کا جی ڈر رہا تھا۔

"یہاں کیوں رک گئے ہیں آپ؟"

"ذرا ٹہلیں گے۔"

"آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ اپنے گھر لے چلیں گے۔"

"ایسے وعدے فضول ہوتے ہیں۔ تمہیں اب تک سمجھنا چاہیے تھا۔"

"لیکن اگر اِدھر سے میرے ابا گزرے تو؟"

"تو وہ کل ہماری شادی کر دینے پر اصرار کریں گے۔"

زارا کا چہرہ تمتما اٹھا۔

"میری تو منگنی ہو چکی ہے۔" زارا نے آہستہ سے جھوٹ بولا۔

"پھر تو اور بھی اچھا ہے۔ شوہر سے محبت بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ خانگی فضا میں تو رومان کا دم گھٹ جاتا ہے۔"

اب زارا کو غصہ آ گیا۔ وہ موٹر سائیکل کی طرف پلٹتے ہوئے بولی:

"مجھے کالج تک چھوڑ آیئے۔"

"پلیز۔"

بڑے مؤدبانہ انداز میں جھک کر اس نے سیلوٹ کیا اور پھر سامنے والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ایک جانب چھوٹے چھوٹے پودے نہر کا پانی اور سبز گھاس کی پٹڑی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگنے لگیں۔

جب وہ ہوٹل تک پہنچے تو ان کی پھر صلح ہو چکی تھی۔

زبیر نے کمرے کے تالے کو کھولا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

زارا کا دل یک لخت زور سے اچھلا۔ اُسے کسی نے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کو کہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کی نظروں میں زرّیں اور شبانہ کی شکلیں گھومیں۔ ان کی ابھی شادیاں ہونا تھیں۔ اگر ــــ اگر ــــ؟

تو پھر ان سے شادی کون کرے گا؟

اماں کے ماتھے پر کلنک کا یہ بڑا سا ٹیکہ لگ جائے گا۔

اس کے بن جانے بڑی فراغت سے گھونسلے میں چوں چوں کرنے لگے اور ــــ

ہوٹل کے کمرے میں غلاظت اور باسی پن کی باس۔ سامنے وارڈروب کے دونوں پٹ کھلے تھے اور اوپر کے تختے پر سے اخبار کا کاغذ لٹک رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر کسی عورت کے بالوں کی پنیں پڑی تھیں۔ زارا نے آگے بڑھ کر یہ پنیں دراز میں بند کر دیں اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

پیچھے بڑی احتیاط سے زبیر نے دروازہ بند کیا اور پھر چابی قفل میں گھومی ــــ

زارا نے لپک کر بھاگ جانا چاہا۔ اس نے جی میں سوچا کہ بھلا میں نے سٹیشن پر جانے کی کیوں نہ سوچی ــــ ہم بھی وہاں لائنوں پر آتی جاتی ٹرینوں کو دیکھتے اور پھر سٹیشن سے باہر نکل کر وہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ پھاڑتی اور گھر واپس آ جاتی عصمت کی طرح ــــ وہاں سے بھاگنے کی راہ تو ہوتی۔ بڑی دلیری سے اس نے کہا:

"یہ جگہ اچھی نہیں ــــ اور امی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

زبیر نے اپنی ٹوپی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی اور اس کے قریب آ گیا۔

وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

زبیر کے بالوں بھرے بازو آگے بڑھے اور اس نے زارا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"چھوڑیئے زبیر صاحب ــــ"

"ڈرتی ہو؟"

"مجھے گھر لے چلیے ــــ پلیز زبیر! مجھے گھر لے چلیے۔"

"یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔"

"میں آپ کو شریف آدمی سمجھتی تھی۔"

اب زبیر کا منہ اس کے جسم کو جگہ بے جگہ چوم رہا تھا۔

"میں شریف آدمی ہوں۔"

"بس آپ مجھے گھر لے چلیے۔"

"کیوں ــــ"

"میری منگنی ہو چکی ہے زبیر صاحب!"

"منگنی ہو چکی ہے تو پھر بھی میں تمہیں حاصل کروں گا ــــ چاہے ایک گھنٹے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔"

پورے ہاتھ کا تھپڑ اس نے زبیر کے منہ پہ مارا۔ اور اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہی اس کی غلطی تھی۔ زبیر جیسے آدمی کو غصہ دلانا بڑی حماقت تھی — وہ بپھرے ہوئے شیر کی مانند اس کی طرف لپک کر آیا اور ایک ہی ریلے میں اسے بہا کر لے گیا۔

وہ پلنگ پر اوندھی لیٹی تھی اور اس کے رخساروں پہ آنسوؤں کا بادل سا چھایا رہا

"سنو — سنو زارا! — میں تم سے شادی کروں گا — میں اور تم اکٹھے رہیں گے — !"

گھونسلے سے گری ہوئی چڑیا چلائی — "اب تو مجھے گھر چھوڑ آیئے۔"

آنسو اس کے حلق میں گر رہے تھے اور زارا کو اس وقت خدا جانے کیوں وہ پنیں یاد آرہی تھیں جو دراز میں پڑی تھیں۔ خدا جانے وہ عورت کتنی جلدی میں یہاں سے بھاگی ہو گی کہ پنیں اٹھانی یاد نہیں ہوں گی؟

جانے وہ اپنی تباہی سے بھی بچی کہ نہیں؟

اسے کالج گئے ہوئے پورے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ اماں پوچھ کر ہار گئیں لیکن اس نے بس ایک ہی جواب دیا:

"اماں! میں اب نہیں پڑھوں گی — بس!"

زبیر نے کئی مرتبہ فون کیا لیکن ہر بار وہ چونگا نیچے دھر دیتی۔ اس کے جی میں اپنی بے غیرتی کے خلاف اتنے سمندر موجزن تھے کہ سارا سارا دن بستر میں لیٹی طوفان بہایا کرتی۔ پھر دو بار زبیر سعیدہ کو لے کر ان کے گھر آیا لیکن اس نے سعیدہ سے بات تک نہ کی اور جب چڑیا اپنے بچوں کو اڑانیں بھرنے کی ترکیبیں سکھا رہی تھی تب اس کی منگنی ہو گئی۔

پہلے تو پون گھنٹہ فون کی گھنٹی بجتی رہی . . . . .

زریں اور شبانہ سکول جا چکی تھیں اور اماں باورچی خانے میں تھیں — پھر اس نے فون اٹھا کر نیچے دھر دیا اور دیوان پہ لیٹی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عصمت خاقل کے ساتھ اب تو خوش ہو گی نا؟ — اس مسرّت میں بھلا کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے؟ — کم از کم اس کا ضمیر تو اسے دن رات ملامت نہ کرتا ہو گا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی بھی اس کی نظروں میں ہوٹل کا کمرہ، وارڈروب میں سے لٹکتا ہوا اخبار اور دراز میں بند لمبی لمبی پنیں گھوم رہی تھیں۔

خدا جانے زبیر کہاں تھا؟

وہ کتنی جلدی قریب آ گئے۔ سالوں کی منزلیں لمحوں میں گزاریں اور پھر سیاروں کی طرح بچھڑ گئے۔ کبھی اس جدائی کا قلق اسے پچھتاوا بن کر ڈستا اور کبھی وہ مکمل طور پہ انتقام کا جذبہ بن کر شمع سی جلنے لگتی۔ کم از کم ایک بار زبیر اس کے ابا سے شادی کی درخواست کر سکتا تھا۔ کم از کم وہ چھوٹی سی کوشش کسی مثبت رنگ کی کرتا تو شاید وہ اسے معاف بھی کر دیتی لیکن دکھ تو یہی تھا کہ زبیر نے کبھی بھی اسے اپنی دلہن نہیں سمجھا۔

چھوٹی چھوٹی راجپوتی مونچھیں اور سانولا چہرہ!

"بھلا اسے کس بات پر مان تھا؟"

اماں کمرے میں آئیں اور انھوں نے چونگا پھر واپس دھر دیا۔

"بازار چلو گی زارا؟" اماں نے پوچھا۔

"کیوں امی؟"

"تمھارے بینتی جوڑے پہ کام کروانا ہے اُسے دے آئیں۔"

"آپ چلی جائیں امی۔"

فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

باہر ایک چڑیا کا بچہ لمبی سی اڑان بھر کر پھر زمین پہ آ رہا۔

اماں نے فون اٹھایا۔

"ہیلو —!"

"جی میں مسز مسعود....."

"اچھا سعیدہ ہے — کیا — ؟کیا تمہارا بھائی زبیر احمد — ؟ نہیں میں نے تو تو نہیں دیکھا —"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیسے — کیسے بیٹا — توبہ توبہ! بخدا دل بیٹھ گیا — لاش کب آ رہی ہے؟"

"آج ہی —"

"میں ابھی آؤں گی — ابھی —"

اس نے اخبار اٹھایا۔

وہی راجپوتی مونچھیں — وہی مسکراہٹ۔

"بے چارہ مر گیا۔ جہاز بند ہو گیا اور مر گیا — نجات مل گئی اسے جلتے پٹرول میں۔"

"خدا جانے کہاں تک دھنس گیا ہوگا؟"

"کیوں مر گیا زبیر — کیسے مر گیا اتنا جاندار شخص؟"

"لوگ کیسے مر جاتے ہیں — انہیں موت نہیں آتی جو اس کی آس کرتے ہیں اور وہ اتنی بلندیوں سے جا گرتے ہیں جنہیں اپنی بانہ بل پہ ناز ہوتا ہے — یہ کیسی انہونی سی بات تھی — زبیر احمد ڈیڈ — زبیر احمد"

وہ سعیدہ کے گھر سے لوٹ کر اپنے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ اوپر موکھے سے چڑیاں اڑ کر جا چکی تھیں۔ گھونسلہ خالی تھا۔ فون کی گھنٹی خدا جانے اب کس لیے بج رہی تھی۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر سر رکھ لیا — اگر سعیدہ مجھے یہ خط پہلے دے دیتی تو شاید زبیر نہ مرتا؟ — اور اگر زبیر نہ مرتا تو شاید زندگی کے کسی موڑ پر میں اسے معاف کر دیتی۔ اس نے اپنا پرس کھولا

اور ایک بوسیدہ خط نکالا — لکھا تھا:

"زارا! میری جان —!

تم مجھ سے ناراض ہو۔ تمہیں میری نیت پر شبہ ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمہارا ہوں۔ تم مجھے سمجھ نہیں پائیں — جینا! — تم بہت خوبصورت ہو اور میں بچپن سے احساس کمتری کا شکار رہا ہوں۔ میں نے تمہارے گرد ہر طرح کی فصیل کھڑی کرنی چاہی — جسمانی اور ذہنی کہ تم بھاگ کر کہیں نہ جا سکو لیکن مجھے ان فصیلوں پر اعتماد نہ رہا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہیں اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ یہ ایک اور فصیل تھی — زارا! ایک کمزور آدمی ایک خوبصورت عورت کو جکڑنے کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔

یقین جاننا زارا۔ اس ہوٹل والے واقعے سے پہلے میں بھی کنوارا تھا۔ اب میری شادی ہو گئی ہے۔ اگر تم مجھے اجازت دو گی تو میں تمہارے والدین کے قدم چوم کر کہوں گا کہ زارا کو مجھے دے دیں۔ میں انہیں منوا بھی لوں گا لیکن ایک تمہاری اجازت کی ضرورت ہے۔

اگر تم نے اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو کسی دن فضا میں جہاز لے جاؤں گا۔ اور پھر اس جہاز پر میری لاش اترے گی۔ خدا کرے جب میری لاش اترے تو تمہاری گود میں میرا بچہ کھیلتا ہو — میں تمہیں اس سے بڑی بددعا نہیں دے سکتا۔

تیرا — زبیر"

فضا میں ایک سفری جہاز بڑی گھن گرج کے ساتھ گزر گیا۔

زارا نے خط اپنے پرس میں رکھ لیا اور موکھے کی طرف دیکھنے لگی۔

چڑیا کا گھرانا کب کا رخصت ہو چکا تھا اور اب وہاں تنکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

زارا نے گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور اپنے جی میں کہا:

"آہ زبیر! کاش میری گود میں تیرا ہی بچہ کھیل سکتا۔ افسوس تو یہی ہے کہ تیری یہ بددعا بھی پوری نہ ہوئی"۔

وہ پہلا پتھر جو اس نے عصمت کو مارا تھا، گھوم پھر کر اسی کے ماتھے کو آ لگا تھا۔

خود شناس

دو گلیاں پیچھے امام بارہ تھا ــــــ لیکن شامِ غریباں کی ملی جلی آوازیں دوسری منزل پر ایسے آ رہی تھیں جیسے برسات میں سیلِ صحرا گیر زور و شور سے بڑھ رہا ہو ــــــ سسکیاں، آہیں، آنسو شام کی اندھی روشنی میں نہ جانے کس ہوائی پالکی پر سوار چلے آ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے جب حضرت امام حسینؓ کا گھوڑا اس کی گلی کے سامنے سے گزرا اور سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس ماتم کناں ساتھ ساتھ امام باڑے کی جانب رخصت ہوئے تو اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے؟

ابراہیم کو عام طور پر خود اپنے فیصلوں کا علم نہ ہوتا۔ فیصلے اچانک اس پر حملہ آور ہوا کرتے ــ اتنے امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوصف اسے دوسروں پر زین کسنے کا فن نہ آتا تھا۔ وہ زیادہ گوئی سے پرہیز کرتا، چونکہ وہ چاندی کے چمچے کو منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا اور اس دنیا میں آنے سے کسی طور پر بھی شرمندہ نہ تھا۔ اس لیے کسی کا زیرِ بار ہونا تو الگ بات تھی وہ تو کسی اور میں بھی حسنِ طلب دیکھ کر ہی کپکپا اٹھتا اور ایسے انتظام سے دوسرے کی حاجت پوری کرتا کہ مدد لینے والا احسان کے احساس سے کبھی بوجھل نہ ہونے پاتا۔

لیکن اس کے گھرانے کی کچھ اور طرح کی زندگی تھی۔ دادی اماں سے لے کر چھوٹے منے

تک یہ لوگ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے آئے تھے۔ ان کی سات پیڑھیاں اس گلی میں، اس گلی سے منسلک دوسری گلیوں میں بڑی ہمہ گیر قسم کی رشتہ گیریاں کر چکی تھیں۔ ان سب کے سروں پر مور مکٹ تھے۔ یہ لوگ اور ان کی موروثی دھاک کے سامنے جھکنے کے تمام باسی موری کے کیڑے تھے۔

آہستہ آہستہ ابراہیم سمجھ گیا تھا کہ مشرق میں خاندان کا تصور کچھ محبت، اخوت اور فریاد رسی کے لیے پیدا نہیں ہوا ہو گا بلکہ خاندان محض سماجی ضرورت کے تحت طاقتور اور سیسہ پلائی دیوار کی طرح بنتے ہوں گے کہ دوسروں کو ان سے سر پھوڑنے کا موقع ملے۔ انفرادی قوت کی جگہ مجموعی قوت کے ساتھ ہر سر اٹھانے والے کا مستک توڑا جا سکے۔ اپنے خاندان کی طاقت سے دوسرے خاندانوں کو ملیامیٹ کرنے کی اجازت ہو ــــــ ابھی وہ دسویں میں تھا کہ اسے یہ بھی سمجھ آ گئی تھی کہ مشرق میں خاندان اور خاندانی نجابت کاسٹ سسٹم ہی کا دوسرا نام ہے۔

اس کا باپ ساری زندگی آدرشوں کا شکار رہا۔ اسے غریبوں سے ہمدردی تھی۔ اسے ملک کی حالت سنوارنے کا شوق تھا۔ وہ لوگوں کے لیے کچھ کر گزرنا چاہتا تھا لیکن ہر جگہ اس کی انا سامنے آ کھڑی ہوتی اور حزن و ملال کی کوئی لہر دھکا مار کر اسے گرا نہ سکتی ــــــ اس کا باپ اپنے وجود کے ادراک سے پرے کبھی سوچ نہ سکا تھا۔ اس کی ذات مرکز تھی اور ساری کائنات، معاشرہ، دوسرے لوگ اس کی اپنی ذات کے حوالے سے تھے۔ اگر وہ تنہا تھا تو ہر شہری تنہا تھا۔ بوٹے، پتے، سورج، بارش کا ہر قطرہ تنہا تھا۔ اگر وہ خوش تھا تو قوس قزح سے لے کر گھاس کے سوکھے تنکے تک سب مسرور تھے۔ اتنی خود پرستی کے باوجود اس کا باپ ساری عمر آدرشوں کا شکار رہا ــــــ صرف اسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تمام آدرش اس نے دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنے کے لیے بنا رکھے تھے ــــــ آدرشوں کا ہنٹر ہاتھ میں لے کر وہ دوسرے کمزور لوگوں کو ان کی کم عقلی، تھوڑدلی، غریبی، ناداری، نااہلی، ناسمجھی کے الزامات دے مارا

سکتا تھا۔ اس کے باپ نے کئی تحریکیں چلائیں، کئی جلسے کیے، کئی کمیٹیوں کو جنم دیا لیکن وہ ساری عمر یہ نہ جان سکا کہ جو آدمی ذات کے چکر میں محبوس ہو وہ آدرشوں کی پوجا تو کر سکتا ہے لیکن خود اپنا چکر توڑ کر آدرش کا حصہ نہیں بن سکتا۔

اس کی ماں رانی مینا وتی نہیں تھی ــــــ

اس کا باپ راجہ گوپی چند بھی نہیں تھا ــــــ

راجہ گوپی چند جو بھرتری ہری کا بھانجا بتایا جاتا ہے ــــــ بھرتری ہری جو راجہ بکرمیت کا بڑا بھائی تھا ــــــ یہ انا کے چکر سے نکلے ہوئے مہاراجے تھے ــــــ ان میں مہاتما بدھ کی روح گھومتی تھی اور وہ دولت کا کرم بھوگ جو غریبی کے چکر سے بھی سخت ہوتا ہے، توڑ کر اپنے آدرش سے ہم کنار ہو گئے تھے۔

جس وقت حضرت امام حسینؓ کا گھوڑا گلی میں سے گزرا، ابراہیم شہ نشین پر ایک ٹانگ دھرے بڑی معمولی نظروں سے نیچے گلی میں دیکھ رہا تھا۔ سونے کے زیورات سے سجا خوبصورت گھوڑا، گھوڑے کی راسیں پکڑے نوجوان، لہو رستے سینے، آنکھوں میں شفا بخشنے والا غم، سب بچے بوڑھے جوان گلی سے گزر رہے تھے۔ اس نے کئی بار یہ جلوس دیکھا تھا لیکن اس میں کبھی شرکت نہ کی تھی۔ گلی کی ماتم کناں آوازیں اس کے کانوں میں رانی میناوتی کا بین بن کر آ رہی تھیں ــــــ رانی میناوتی جو بوڑھی تھی، جس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں لیکن جب اس نے اپنے بیٹے گوپی چند کو صندل کی چوکی پر بیٹھ کر اشنان کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی اور چلائی:

"اے میرے بیٹے! بات سن!! تیرا حسن دیکھ کر میں دن رات سوچ میں پڑی رہتی ہوں تیرے باپ کا حسن جل کر فنا ہو گیا۔ تو جوگ لے لے بامراد ہو گا ــــــ یہ زمانہ یہ عالم خواب ہے جسے جال کی شکل دے دی گئی ہے۔ بیٹا! تو بھی جوگی بن جا ــــــ غیر فانی ہو جائے گا۔"

ساری حویلی میں ایسا تو ایک شخص بھی نہ تھا جو ابراہیم کو جوگ لینے دیتا لیکن اس کے اندر ــــــ کہیں بہت اندر اپنی ذات سے چھٹکارا پانے کی خواہش جنم لے رہی تھی۔ وہ سمجھ

دولت کا کرم بھوگ توڑ کر نروان حاصل کرنا چاہتا تھا ـــــ اپنے اوّر شوں کا حصّہ اور کیسے بنا جا سکتا ہے؟ اسی طرح ایک بار پہلے بھی اس نے سوچا تھا۔ تب وہ ابھی کالج میں پڑھتا تھا اور اپنے باپ کی تحریکوں کو اچنبھے کی نظر سے دیکھتا تھا ـــــ ابھی اس نے ان تحریکوں کمیٹیوں، جلسوں، میٹنگوں کے پیچھے اپنے باپ کی انا کا ہنٹر نہیں دیکھا تھا۔

وہ نچلے صحن میں اپنے آباواجداد میں سے دفن کسی ایک کی قبر پر بیٹھا تھا جب اس نے سنتو جمعدارنی اور اس کے بچے کو دیکھا۔ ننگ دھڑنگ سیاہ بچہ دسمبر کی سردی میں ٹھنڈے فرش پر بیٹھا رو رہا تھا اور سنتو آنگن کے نکلے میں نیلی ٹیپ لگا کر صحن دھونے میں مشغول تھی۔ جب بچے کی چیخ گلوگیر ہو جاتی تو سنتو جھاڑو چھوڑ کر آتی، جھولی میں ڈالے ہوئے مالٹے کی ایک پھانک نکالتی، بچے کو پکڑاتی اور واپس کام پر چلی جاتی ـــــ کچھ تو بچے کو ایسی فریبی ماں پر غصّہ تھا۔ کچھ ابھی وہ اپنے ہاتھوں سے ٹھیک طور پر کھانے جوگا نہ ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ پھانک کو منہ میں ٹھونسنے کی ترکیب کرتا لیکن جب یہ ٹھونسنے چوسنے کا عمل درستگی سے نہ ہو پاتا تو سنتو کا بالک پھر منہ کھول کر رونے لگتا۔ کچھ عرصہ تک تو ابراہیم یہ کرشن لیلا دیکھتا رہا۔ پھر جب ایک بار سنتو غسلخانے میں بالٹی لینے گئی تو اس نے اس موت سے سنے بچے کو اٹھایا اور پرکھوں کی قبر پر رومال بچھا کر اپنے پاس بٹھایا اور چلغوزے چھیل چھیل کر کھلانے لگا۔ بچے نے شاید اس سے پہلے اتنی قدر و منزلت اس گھر میں کبھی نہ پائی تھی۔ وہ جب سے پیدا ہوا تھا اس گھر میں متواتر آ رہا تھا اور ٹھنڈے فرشوں پر رو رو کر وقت گزارنے کا عادی تھا۔ ابراہیم کے پاس بھی بہلانے کے لیے کچھ اور چیز میسر دست نہ تھی۔ وہ احتیاط سے چلغوزے چھیلتا اور بچے کے لعاب سے لتھڑے منہ میں ڈال دیتا ـــــ پتہ نہیں یہ کھیل کب تک جاری رہتا لیکن اوپر والی منزل سے دادی اماں کی کڑک دار آواز آئی:

'ابراہیم ـــ!'

"جی دادی ماں!"

'ذرا اوپر آؤ'۔

"جی میرے کالج کا ٹائم ہو گیا ہے"۔

"بس ذرا دیر کے لیے ـ"

ابراہیم اوپر دادی کے کمرے میں گیا۔

دادی کا کمرہ ساری حویلی کا دارالخلافہ تھا۔ یہاں بڑے اہم فیصلے ہوتے تھے۔ یہاں قسمتیں، جائیدادیں، شادی بیاہ، دوستی دشمنی کے تمام ریکارڈ رکھے جاتے تھے۔ دادی بڑی پُر وقار خاتون تھیں۔ اس نے اس عہد میں پانچ بہوؤں کو حویلی سے بچھڑنے نہیں دیا تھا۔ عقابی نظروں سے گھر کے تمام انتظامات پر غور کرتی رہتی تھی۔ اس اتفاقی سرکشی کو بھی اس نے اوپر والی منزل سے عین وقت پر دیکھ لیا تھا اور دادی حصّہ رسد بانٹنے میں ہمیشہ جلدی کرتی تھی۔ دادی کا مقولہ تھا کہ سنپولیا مار دو۔ سانپ آپ ہی مر جائے گا۔ چھوٹی سی کوتاہی پر بڑا سا ڈھیلا مارو تاکہ چشمہ ندی اور ندی تالاب نہ بنے۔

جب ابراہیم پورے تین گھنٹے دادی کے پلنگ پر بیٹھا رہا اور اس کے چار پیریڈ ضائع ہو گئے تو وہ تیسرے ملک کے کسی ایسے ڈیلی گیٹ کی طرح اٹھا جس کی پیشی سُپر پاورز کے سامنے رہی ہو۔

'بیٹا ـــ! کان کھول کر آخری بار سُن لو ـــ خاندان کی عزت کوئی ایک پشت نہیں بناتی۔ یہ کئی پشتوں کا ثمر ہے جو تم لوگوں تک پہنچا ہے ـــ میں تمہیں اس قدر خودغرض نہیں ہونے دوں گی کہ پائی پائی جوڑی پُونجی کو یوں برباد کرنے دوں ـــ تمہارا باپ کچھ کم خدا ترس نہ تھا۔ ساری عمر لاکھوں خرچ کیا غریبوں پر ـــ کئی گھرانے پال دیے۔ کئی تحریکیں چلائیں۔ کتنی کمیٹیاں بنائیں لیکن خاندانی وقار کو قائم رکھ کر ـــ کچھ اپنی روایات کو ملیامیٹ نہیں کیا۔ تمہاری عمر چھوٹی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ان کمینوں کو اگر منہ لگایا جائے تو یہ سر پر آ بیٹھتے ہیں'۔

ابراہیم نے ابھی تازہ تازہ دینی کتابوں میں سے اخوت کا سبق حاصل کیا تھا اس لیے وہ گڑبڑا گیا۔ ویسے بھی وہ بحث کرنے کا عادی نہ تھا۔ اسے نہ کسی نکتۂ نظر سے شدید محبت تھی نہ ہی کسی خاص نظریے سے شدید قسم کی نفرت تھی۔ وہ چھوٹی عمر میں ہی جان گیا تھا کہ انسانی کوشش کا ثمر تمام تر میٹھا کبھی نہیں ہوتا۔ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں آگے چل کر کئی رکاوٹیں، کئی سقم، کئی خامیاں خود بخود ہی کہیں سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کے معاملے میں بنی نوع انسان کی قسمت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ ہر خوشی میں کہیں نہ کہیں تھوڑا غم بھی چن لیتے تھے اور ہر غم کے اندر ہی اندر کہیں نہ کہیں تھوڑی سی چھپی ہوئی خوشی بھی سمیٹ لیتے ہیں اس لیے اس نے دادی کے نکتۂ نظر پہ اعتراض، بحث، کٹ حجتی کچھ بھی نہ کی اور اپنا رویہ بدل لیا۔ اب وہ ساری حویلی میں ایک ننھی سی مسکراہٹ لیے چلتا پھرتا۔ کوئی بھی اسے گھر کے کسی رام روپے میں شمولیت پہ آمادہ نہ کر سکا۔ وہ تیسری منزل پہ رہتا اور اپنی کتابوں کے علاوہ کسی سے علاقہ نہ رکھتا۔ کبھی کبھی گھٹن سے مجبور وہ باہر نکلتا اور شہ نشین پہ ایک ٹانگ رکھ کر نیچے گلی کا منظر دیکھنے لگتا۔

اس شام بھی ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی اور بھیگی رات میں ماتم کناں لوگوں کی آوازیں پچھلی ڈھلوان گلی سے ہو کر شہ نشین تک آ رہی تھیں۔ اس اونچی ماڑی سے ارد گرد کا سارا محلہ بخوبی نظر آتا تھا۔ گلی میں اینٹوں پہ پھسلن تھی۔ کچھ بچے تھوڑی دیر پہلے خاکی لفافے، مونگ پھلی کے چھلکے اور چند باسی شکر قند یہاں گلی میں پھینک کر جا چکے تھے۔ پھر گلی کی نکڑ پہ ایک وہیل چیئر نظر آئی۔ اس کرسی میں ایک معذور لڑکی بیٹھی تھی اور اس سادھنی کو ایک بیس بائیس برس کا گہرا سانولا لڑکا دھکیلتا چلا آ رہا تھا۔ نوجوان مدقوق صورت تھا اور اس کے چہرے پہ چیچک کے داغ تھے۔

شاید اس سے پہلے بھی اس نے کئی بار اس معذور لڑکی اور مدقوق نوجوان کو دیکھا تھا لیکن اس شام جب وہیل چیئر گلی کی چڑھائی پہ ابھری تو پہلی بار ابراہیم کو خیال آیا کہ شاید یہ لڑکی چل پھر نہیں سکتی۔ ابھی وہ نیوی بلو پینٹ اور نیوی بلو لڑکے کے متعلق کچھ واضح سوچ بھی نہ پایا تھا

کہ ڈھلوان، پھسلن اور چھلکوں کی وجہ سے وہیل چیئر نے ایک لڑھکنی کھائی۔ لڑکی منہ کے بل گری اور وہیل چیئر اپنے مومینٹم سے بے بس الٹی سیدھی ہوتی نیچے کی طرف سرپٹ جانے لگی۔

جتنی سرعت سے کرسی نیچے جا رہی تھی اتنی تیز رفتاری سے ابراہیم نے سیڑھیاں اترنی شروع کر دیں۔ وہ لمحے کا آدمی تھا۔ زیادہ ٹیوے لگانے کی اس میں صلاحیت نہ تھی کسی کسی لمحے ہونی کے سواگت میں وہ ایسے لگ جاتا کہ پچھلی سوچ سے اس کا عمل یک دم الٹ ہو جاتا اور وہ لوگ جو اسے جانتے تھے اس کا عمل سمجھ نہ پاتے۔ جس وقت اس نے لڑکی کو منہ کے بل گرتے دیکھا وہ بالائی منزل سے چیتے کی طرح لپکا اور اولمپک کھلاڑی کی طرح گلی کی چڑھائی پر بھاگنے لگا۔ گلی میں دو چار دکانیں بھی تھیں جن میں رنگ ساز، پکوڑے تلنے والا اور سبزی فروش اس حادثے سے بے خبر گاہکوں سے باتیں کرنے میں مشغول تھے لیکن چند بچے اس سے پہلے پہنچ گئے تھے اور وہیل چیئر کو اونچائی کی طرف لے جانے میں مصروف تھے۔ جب ابراہیم جائے حادثہ پہ پہنچا، لڑکی پہلو کے بل پڑی تھی اور بے ہوش تھی۔ اس کی ناک اور منہ سے لہو رواں تھا اور وہ گردن چھوڑے پڑی تھی۔ نیوی بلو لڑکا اپنے کیری مفلر سے اس کا چہرہ صاف کر رہا تھا۔

جب بھی ابراہیم پہ لمحہ سوار ہوتا اسے خود سمجھ نہ آتی کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے لڑکی کا خوفناک چہرہ دیکھا اور پھر تھبتہ بھر کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ جس رفتار سے وہ بغلی گلی میں کھڑی اپنی کار تک پہنچا اور جس تیزی سے اس نے لڑکی کو پچھلی سیٹ پہ پٹک کیا یہ سب کچھ بھی صرف لمحوں کی بات تھی۔

جب وہ مال روڈ پہ کاریں بچاتا تیزی سے جا رہا تھا —— تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شاید وہ ہسپتال جا رہا ہے۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں —— ؟" سریلی آواز میں لڑکے نے سوال کیا۔

"ہسپتال :"

"اچھا جی — !"

شاید وہ لڑکا ساری زندگی سے اچھا جی کہنے کا عادی تھا۔

جس وقت ایمرجنسی کا سٹریچر لایا گیا اسے پورا یقین تھا کہ لڑکی راستے میں ہی کہیں فوت ہو چکی ہے۔ اس کے چہرے اور کپڑوں پر جما ہوا خون تھا اور گردن ایسے مڑی ہوئی تھی جیسے مروڑی گئی ہو۔

"آپ جا کر یہ ٹیکے لے آئیں — جلدی سے جلدی۔" ڈاکٹر نے اسے ایک پرچی تھما کر کہا۔

لیکن جب وہ باہر جا رہا تھا تو نرس نے اپنی پٹاخے دار آواز میں ہنس کر کہا:

"ڈاکٹر صاحب! اب یہ آ چکا۔ یہ لوگ ایکسیڈنٹ کر کے غائب ہو جاتے ہیں ہمیشہ۔"

نیوی بلو لڑکا سن کر کچھ بولا لیکن آواز اس تک نہ پہنچ سکی۔ ابراہیم کے جی میں آئی کہ ہسپتال پہنچانے کے بعد مزید جھمیلوں میں پڑنے کے بجائے وہ حادثہ کرنے والوں کی طرح بھاگ ہی جائے لیکن وہ زیادہ دیر تک گریز کی لاٹوں پر سوچنے کا عادی بھی نہ تھا۔ لڑکی کی مرہم پٹی بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ وہ ٹیٹنس کا ٹیکہ اور دوائیاں لے کر واپس بھی آ گیا۔ لڑکا ابھی تک اپنے کیسری مفلر سے لڑکی کے بازو پونچھنے میں لگا ہوا تھا۔

یہ دونوں بہن بھائی بھی عجیب قسم کی مخلوق تھی، جیسے برصغیر کی ڈکوت جاتی کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ برہمن، کچھ گجر، کچھ سانسی لوگوں کی ملاوٹ سے بنا ہوا قبیلہ — ایسے ہی نسیم اور منظور بھی بڑی ملاوٹوں سے بنے تھے۔ رنگتیں کول بھیل دراوڑوں کی تھیں۔ چہرے کے نقوش تیکھے اور کاٹھ لوگوں کی یاد دلاتے تھے۔ تا عوامی تھے۔ زبان پنجابی آمیز اردو تھی — لباس بھڑکیلے رنگوں کا تھا جن رنگوں کے پیچھے انھوں نے اپنی غریبی چھپا رکھی تھی اور ساری شخصیتیں احتیاج، مجبوری، کسرِ نفسی، مظلومیت اور بیچارگی کے خمیر سے گندھی تھیں۔

اگر ابراہیم سمپورن راگ تھا تو نسیم فقط ایک چیخ تھی۔ جس طرح چلتی کار کسی کتے کے اوپر سے گزرے تو بلکتے سسٹم سے نکلتی ہے۔ سوسائٹی کے خلاف، فطرت کے خلاف خود اپنے وجود کے خلاف یہ چیخ مارتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ منہ پر دھر لیا تھا اور آواز کو دوسرے لوگوں کے کانوں تک پہنچنے نہ دیا تھا۔ ابراہیم چھ دروازوں والی حویلی میں رہتا تھا ایسی حویلی جس کے اندرونی آنگن میں اسلاف کی چند پختہ قبریں تھیں جن پر گھر کے بچے بیٹھ کر تختیاں لکھا کرتے اور گھر کی بڑی بوڑھیاں انہیں اٹھا اٹھا کر کہتیں:

"ہائے کیا زمانہ ہے اپنے بزرگوں کی قبروں پر بیٹھتے شرم نہیں آتی۔ ایک تو تمہاری ماؤں کو سنبھالنے کا طریقہ نہیں آتا — کھلا چھوڑ رکھا ہے بچوں کو۔ نہ کوئی عقل نہ موت۔"

بچے تھوڑی دیر کے لیے قبروں سے دور ضرور ہو جاتے لیکن پھر یہی قبریں کھیل کا مرکز بن جاتیں۔ اونچ نیچ کا کھیل تو ان قبروں کے بغیر کھیلا ہی نہ جا سکتا تھا۔ کئی پشتوں سے گھرانہ اکٹھا تھا اور اس کی سالمیت کی وجہ سے دوسرے گھرانے ان سے ڈرتے اور ادب کرتے تھے۔ اس گھرانے میں پیار اور نفرت دونوں متوازی پٹڑیوں پر بچھی تھی اور گھرانے کی عظمت اس کی روایات، اس کے سکہ بند اصولوں کی سنہری جیلیڈ کے ساتھ واں! واں! اس پٹڑی سے گزر رہی تھی۔

اس حویلی میں گروہی اور انفرادی زندگی دونوں کے امکانات بہت روشن تھے۔ جو افراد رانا سانگا کی طرح مردِ میدان تھے وہ معرکوں کا وقت گزر جانے کے بعد آنگن میں پلنگوں پر تخت پوشوں پہ نیم دراز ٹولیوں میں بیٹھتے اور اپنے اپنے تجربات کے زخم ایک دوسرے کو دکھاتے۔ داد دیتے اور وصول کرتے۔ جن کو خاموشی، تنہائی اور اپنی ہی جلد میں غائب ہو جانے کا شوق ہوتا وہ اس گھر میں SNAIL کی طرح اپنے جسم میں ہی اپنا گھر اٹھائے پھرتے ادھر لوگوں کی یورش ہوتی اور وہ اپنی ہی جلد اپنی ہی آنکھوں اور اپنے ہی ناخنوں کے اندر

غائب ہو جاتے۔

ابراہیم کی ماں دادی کی منظورِ نظر تھی ـــــ سب سے بڑی بہو ہونے کے ناطے بھی اس کی زندگی پٹ رانیوں کی طرح گزرتی۔ وہ پانچ فٹ نو انچ اونچی اور بڑی گھیرے دار عورت تھی۔ اس کی انگوٹھیوں سے لدے ہاتھ، بھاری بھاری گول بانہیں، امتناعی اشاروں میں کھلتی بند ہوتی رہتیں۔ دراصل دادی اس سے ایسے ڈرتی تھی جیسے ملک کا صدر پرائم منسٹر سے بدکتا ہے ـــــ لیکن اس بگیا کے گھر جب ابراہیم جیسا انوٹھا بیٹا پیدا ہو گیا تو وہ بہت تلملائی۔ ابراہیم سرمہ تھا۔ آنکھوں میں پھرتا رہتا لیکن تکلیف نہ ہوتی۔ چھوٹا تھا تو پہروں پکی قبروں پہ بیٹھا رہتا۔ نہ کسی سے جھگڑتا نہ کھانے کو کچھ مانگتا۔ اس کی گرانڈیل ماں اسے بڑا سسکارتی لیکن وہ کچھ ایسی ٹھنڈی مٹی کا مادھو تھا کہ اس تین منزلہ حویلی کے تکبر میں گوندھا ہی نہ گیا۔ پڑھائی میں اتنا تیز تھا کہ ماں کو آنکس مارنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ عادات تربیت کے بغیر من موہنی تھیں۔ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا لیکن شوہر کی موت کے بعد ابراہیم کی ماں خوش نہیں تھی۔ وہ منوانے والوں میں سے تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ابراہیم حویلی میں ویسے ہی مانا جائے جیسے اس کے ابا جی کا دبدبہ تھا اور پرنیچے غلام گردشوں میں ابراہیم کی ماں کا ایک تہلکہ تھا۔ زبان درازی میں وہ حرفِ آخر تھی۔ اس پھاڑ کھاؤ نے بڑی کوشش کی کہ ابراہیم جو اکلوتا بھی تھا کچھ ریڑھ کی ہڈی مضبوط کر لے اور باپ کی جگہ جلد از جلد پُر کر دے لیکن اس لڑکے کو آنکھ بھوں ٹیڑھی کرنے کی عادت نہ تھی۔ بجھی بجھی اجلی طبیعت والے لڑکے کی اس اجلی گزران پہ ماں کا دل کٹ کٹ جاتا۔ چونکہ ابراہیم میں ایسا کوئی نقص نہ تھا جس پہ حرف گیری کر سکتی اس لیے دل ہی دل میں کڑھتی۔ دعائیں مانگتی کہ یا میرے مولا! اس چھچھوندر کو تو ہاتھی کی سخت جلد عطا کر۔ کچھ تو اسے بھی حویلی والے محسوس کریں۔ کچھ تو یہ بھی اودھمی ہو کہ دوسروں کو اس کا پاس رہے ورنہ جب بڑا ہو گا تو اس بڑے پہ پیار میں، اس کھلے دربار میں، لوگوں سے لدی پھندی حویلی میں اس کی جریب جریب چلتی بات کو کون سنے گا!

لیکن ابراہیم میں نہ جانے کیا نقص تھا۔ وہ کندھا مارے بغیر، اونچا بولے بنا ہی وقت گزارتا رہا۔ پتہ نہیں یہ ماں کی شخصیت کا ردِ عمل تھا کہ باپ کے آدرشوں سے ناکام محبت تھی وہ اٹھتی جوانی میں بوسیدہ نظر آنے لگا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو قبروں کے اردگرد گھومتا تھا۔ جب تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے باپ کا بزنس سنبھالا تو تیسری منزل میں کابوس صورت، سنیاس روپی رہنے لگا۔ تیسری منزل تک بھنور ڈالنے ماں کم ہی جاتی تھی۔ حویلی کی زندگی اس کے اردگرد کی بھنبھناہٹ تھی۔ چونکہ ابراہیم کے ہاتھ میں نفرت یا محبت کی آری یا کٹاری نہ تھی اس لیے وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑے سے بڑا معاہدہ کر سکتا تھا اور بڑے سے بڑے وعدے کو ایفا کیے بغیر بھی گزر بسر کر سکتا تھا۔

لیکن منظور اور نسیم سے ملنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک چھوٹا سا طوفان آ گیا ـــــ آج تک جس فائل پہ ایک بھی مخالفت کا حرف نہ لکھا گیا تھا، وہی فائل اب کرے کرے پھرنے لگی اور گھر کا ہر فرد جلے بجھے حروف میں اس پہ نوٹنگ کرنے لگا ـــــ وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ حویلی کے پچھواڑے والی گلی میں منظور کے گھر کبھی کبھی جانے لگا تھا۔

لیکن منظور کے گھر آنا جانا کچھ قصداً نہ تھا۔ جس دن وہ نسیم کو ایمرجنسی وارڈ میں چھوڑ کر حویلی لوٹا، ابراہیم ان دونوں کو بھلا چکا تھا۔ لمحہ گزرنے کے بعد وہ اس کا تابع نہ رہتا ـــــ دراصل ابراہیم نہ تو خوشی کی پھوار میں نہاتا رہتا نہ ہی غم کے تناؤ میں اپنے آپ کو کسنے کا عادی تھا وہ ان دونوں کیفیتوں کے عین درمیان کہیں آنند سے زندگی بسر کرنے کا قائل تھا۔ اس روز بھی جب نسیم وہیل چیئر سے گری اور ابراہیم ہسپتال سے گھر لوٹا تو جس وقت اس نے اپنی کاف پہ کیولیٹر کا بٹن دبایا، اس کے ساتھ ہی منظور کا سرکٹ کر گیا اور اس کی عام سادہ بے مزہ زندگی کا کرنٹ بحال ہو گیا ـــــ لیکن منظور کی زندگی میں اتنی روشنی آ گئی کہ بے چارہ چندھیا گیا۔ منظور تمام بے آسرا لوگوں کی طرح ایک طاقتور خاندان کے بغیر معاشرے کے انصاف سے تہی، دوستوں سے خالی زندگی گزار رہا تھا۔ اس لیے جب ابراہیم اس کے ساتھ ہسپتال

میں داخل ہوا تو وہ اسے گھٹتا بڑھتا چاند نہ سمجھا بلکہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پٹرومکس سمجھ بیٹھا۔ سارے محلّے میں بڑے ملک صاحب کا بیٹا ایک دیومالائی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے اردگرد کئی کہانیاں پھیلی تھیں۔ اس لیے منظور نے جب ابراہیم کو اتنے قریب سے دیکھ لیا تو اس نے اپنے تمام ملنے والوں کو حادثے کی ایک ایک تفصیل سنائی۔ کیسے ملک ابراہیم اسے اپنی سفید مرسیڈیز میں بٹھا کر ہسپتال لائے؟ ـــ کیسے جاتے وقت انھوں نے جتائے بغیر نسیم کے سرہانے ایک ہزار روپے رکھے؟ ـــ کیسے انھوں نے وارڈ کے تمام ڈاکٹروں کو بلا کر منظور کو اپنا محلّے دار بتایا؟

منظور کے لیے یہ حادثہ شکرگزاری کا موقع تھا۔ اتنی توجہ، اتنی عافیت اسے آج تک نہ ملی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت کار میں چڑھنے کا جھوٹا سچا خواب بھی نہ رکھتا تھا۔ نسیم کے چہرے پر چھ انچ لمبا زخم نیلا تھا لیکن وہ اندر باہر اتنے زخم کھا چکی تھی کہ اس حادثے کا اس نے بھی دل سے شکریہ ادا کیا جس نے پورے ایک ہزار روپے ایک بار دیکھنے کو تو دیے۔ ملک ابراہیم کے چہرے کو چند منٹ قریب سے تو دیکھا۔

بہت امیر آدمی اور لاچار بے بس غریب آدمی کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ بہت چھوٹے واقعات پر اپنے خوابوں کی اساس رکھتا ہے۔ امیر آدمی اس لیے کہ اسے دنیاوی جدوجہد سے فراغت ہوتی ہے اور وافر وقت میں اس سے بہتر مصرف اور کوئی نہیں ہوتا ـــ غریب آدمی چھوٹے واقعات کو زندگی کے نیک شگونوں میں سے سمجھتا ہے۔ ان سے خوابوں کو جنم دینا اس کے لیے کھڑی دھوپ سے بچ کر سائے میں بیٹھنے کا عمل ہوتا ہے

جب نسیم صحت یاب ہو گئی اور دوبارہ دہلیل چیئر پر آنے جانے لگی تو ایک دن منظور ایک چھوٹا سا کیک شکرانے کے طور پر لے کر حویلی پہنچا ـــ اس وقت وہ گنگ بجانے والوں کی طرح پسیجا پسیجا لگتا تھا۔ حویلی کے پہلو میں چور دروازہ تھا۔ سارا دن بڑا پھاٹک بند رہتا اور اسی بغلی دروازے سے آمدورفت رہتی۔

منظور کے ہاتھ میں کیک کا ڈبہ تھا اور وہ اس دروازے کے آگے بھیک مانگنے والوں کی طرح کھڑا تھا۔ بڑی دیر وہ یونہی کھڑا رہا۔ آخر اس نے جرأت کر کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بوڑھی ملازمہ باہر آئی ـــ اور حقارت سے منظور کو دیکھ کر بولی:

"کیا ہے؟"

"ابراہیم صاحب ہیں؟"

"ہیں تو سہی لیکن آرام کر رہے ہیں"۔

منظور کا دل بجھ سا گیا۔

"کیا ہے؟" بڑے گھر کی ملازمہ تو آخر روز ملکوں میں رہتی تھی، ڈٹ کر بولی۔

"یہ کیک انہیں دے دینا"۔

"انھوں نے یہ کیک کیا کرنا ہے۔ ان کو کیک بتیرے ـــ"

بڑے آدمی کے ساتھ چھوٹا آدمی ایسے تیرتا ہے جیسے لکڑی کے ساتھ لوہا ـــ لیکن منظور کے پاس ایسے تیرنے کی امید بھی باقی نہ رہی تو وہ بجھ کر بولا:

"بس تم یہ حقیر سا تحفہ انہیں دے دینا ـــ کہنا منظور آیا تھا"۔

"کہہ دوں گی ـــ"

کچھ لوگ جب اپنے گھر میں تیاری کرتے ہیں ـــ کسی دعوت کا کھانا منگنی یا شادی کا انتظام، کسی سالگرہ کا اہتمام تو اس وقت انہیں لگتا ہے کہ انتظامات بہت معقول ہیں اور مہمان اس اہتمام کو دیکھ کر بہت خوش اور متاثر ہوں گے لیکن مہمانوں کی آمد پر سارا انتظام نہایت بھونڈا، بے قیمت اور بے ثمر لگتا ہے۔ یہی احساس منظور کو واپسی پر ہوا۔ جب اس نے اور نسیم نے مل کر کیک خریدا تھا تو ان دونوں کا خیال تھا کہ اس کیک سے خاطر خواہ طور پر شکریہ ادا ہو سکتا ہے اور اب واپسی پر اسے لگ رہا تھا کہ اس نے موٹی مائی کو کیک پکڑا کر ملک ابراہیم کی توہین کی ہے۔

شام کو ابراہیم تیسری منزل سے اترا۔ اس وقت تہمد باندھنے والی مضبوط جسم کی بوڑھی ملازمہ وہ کیک بچوں کو دے چکی تھی اور بچے کیک کے ٹکڑوں کو مٹھیوں میں بھینچ بھینچ کر اس کا چورا بنا رہے تھے اور ٹوبی کو کھلا رہے تھے۔

'اوئے احمقو! کیک کُتے کو کھلاتے ہیں کوئی؟' ابراہیم نے بغیر سختی کے ڈانٹ کر کہا۔

'کوئی بات نہیں ابراہیم بھائی! یہ کیک کھانا کس نے تھا؟'

'کیوں۔ میں کھا لیتا!'

'آپ کے کھائیں دشمن ___ وہ کالا منظور دے گیا تھا ___ منظور! آپ کیوں اس کے ہاتھ کا کیک کھائیں'۔

ابراہیم کے سامنے ایک بار ساری حویلی گھوم گئی۔ یکبارگی سب کچھ ڈولا ___ کیا ہم اس قدر کاسٹ سسٹم کے شکار ہو چکے ہیں کہ اب اپنے سے نیچے والوں کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھا بھی نہیں سکتے؟

اس سوال کے جواب میں ابراہیم منظور سے ملنے پچھواڑے کے ٹوٹے پھوٹے گھروں میں گیا۔

یہ ایک چھوٹی سی اناتھ بستی تھی۔ یہاں متعفن تنگ گلی کے ارد گرد ایک ایک دو دو کمروں کے کچے پکے مکان تھے۔ اسی گلی میں گول گپے والا مقیم تھا۔ یہیں گھر گھر کپڑے دھونے والی مائی صغرا اور اس کا سدا رُت بیمار بیٹا رہتا تھا۔ یہیں کئی ایسے ٹوٹے پھوٹے لوگ تھے جو زندگی کے ساتھ بغیر کسی قسم کی بھیک کے زندہ رہنے پر مجبور تھے۔

منظور کے گھر کے سامنے چھوٹے بورڈ پر لکھا تھا ___ 'ریڈیو آرٹسٹ' ___ یہ اس نے محلے میں اپنی عزتِ نفس برقرار رکھنے کے لیے ٹانگ رکھا تھا کیونکہ عام زندگی میں اس کا ریڈیو سٹیشن سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ تھا اور یہ بھی منظور کو صرف وہم ہی

تھا کہ لوگ اس چھوٹے سے بورڈ کو پڑھ کر کچھ اس کی عزت بحال کر دیں گے۔ سارا محلہ جانتا تھا کہ منظور کی ماں ایک چھوٹے درجے کی گانے بجانے والی عورت تھی جو گھر گھر شادی بیاہ پہ جایا کرتی۔ پھر کچھ عرصہ بعد ڈھموں نے گانا بجانا چھوڑ دیا اور پیشہ کرنے لگی۔ اس میں بھی اتنا ادھار جمع ہو گیا کہ وہ پیشہ چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی ___ لیکن منظور اور نسیم کی مجبوری نے اسے گھر گھر برتن مانجھنے پہ مجبور کر دیا۔ اب منظور کی ماں بہت بڈھی ہو چکی تھی۔ وہ کئی بار آنگن میں ٹکے ہوئے دو خالی کنستروں سے ٹکرا جاتی۔ اسی لیے منظور خشک دودھ والے کی دکان پہ کام کرنے لگا تھا۔ یہاں اس نے اپنا نام منظور قریشی بتا رکھا تھا لیکن دکان والے بھی گھاگ تھے۔ جس طرح مشرق کے لوگ دوسروں کی ہسٹری میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں، وہ بھی منظور کی پوری چھان بین کر چکے تھے اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے جو اس کے سوشل سٹیٹس کے موافق آتا تھا۔

پہلے تو ابراہیم، ریڈیو آرٹسٹ منظور کے گھر ازراہِ مروت آیا۔ پھر بوڑھی ڈھموں کے اصرار پر ایک دو بار گیا۔ اس کے بعد منظور اور نسیم کی کس مپرسی کے باعث وہ ان کے گھر جانے پر مجبور رہا۔

ابراہیم کو ان تینوں روحوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ نسیم سے محبت کرنا تو درکنار راغب تک ہونے کا خیال نہ رکھتا تھا۔ اس کی منظور سے بھی کسی لیول کی دوستی نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ ان کے گھر جاتا رہا ___ وہ اپنے بڑے نام، بڑے خاندان کی تھوڑی سی عزت ان لوگوں میں بانٹنا چاہتا تھا ___ پھر وہ تینوں محض اس کے انتظار میں زندہ رہنے لگے۔ بہرکیف اس توقع سے اپنے آپ کو چھڑانے کے وہ قابل نہ تھا۔

ایک رات جب ابراہیم کی بیڈ رپورٹ دادی کے سامنے پیش کی گئی اور اس کے کا کچا چٹھا بیان کیا گیا تو آدھی رات گئے تک کانفرنس ہوتی رہی۔ صبح صبح دادی نے ابراہیم کو طلب کیا۔ ابراہیم دادی کے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ گیا۔ وہ بڑے غصے سے ایک دولائی

میں شلنگے ڈال رہی تھی۔

"بیٹھو ——" دادی نے کہا۔

بڑی دیر خاموشی رہی۔

"آپ نے بلایا تھا دادی ماں"۔

"ہاں —— یہ کیا قصّہ ہے؟"

ابراہیم نے چند لمحے قصّہ کی نوعیت کے متعلق سوچا لیکن وہ اس قدر سالخوردہ نہ تھا کہ دادی کی بات نہ سمجھ سکتا۔

"میں نے سنا ہے تو منظور کے گھر جاتا ہے"۔

کچھ کچھ بات گھونگھٹ کھول کر سامنے آ گئی۔

"کبھی کبھی ——"

"یہ جو بظاہر عزت والے لوگ ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی مفت نہیں عزت دولت کمائی ہوتی۔ پڑھیاں لگتی ہیں اور غریب لوگوں کا دل چاہتا ہے کہ چالاکی سے اس کے حصہ دار بن جائیں۔ بدنامی تو تیری ہو رہی ہے اس بیسوا کا کیا جائے گا"۔

"لیکن ہوا کیا ہے دادی ——"

"ہوا یہ ہے کہ بدنامی ہو رہی ہے ملکوں کی —— نسیم پاپی کنواں ہے اس سے نکل آ نہیں تو ڈوب مرے گا"۔

"لیکن نسیم؟ —— وہ بیچاری تو ——"

اس کی نظروں کے سامنے بدشکل گنڈویا سی نچڑی نچڑی چھنی چھنی مردہ سی نسیم آ گئی —— کچی سیون کی طرح جا بجا ادھڑی ہوئی نسیم ——

"یہ بے چاریاں ہوتی ہی ایسی ہیں —— قدموں میں بٹھاؤ تو چھلانگ مار کر گودی میں آ بیٹھتی ہیں —— انگشتری میں نگینہ کا پانی نہیں ڈالتے —— یہی مت ہے تم مردوں کی

جب تم کو ڈوب مرنے کے لیے چلّو بھر پانی نہیں ملتا تو پھر تم لوگ چلّو بھر عورت میں ڈوب مرتے ہو، ہمیشہ کے لیے —— اگر اس سے بیاہ کرو گے تو میں جان سے مار دوں گی"۔

نسیم سے بیاہ؟

اس کے لیے یہ خبر ہی وحشت ناک تھی۔

بیاہ کا نام سن کر وہ دیر تک ہنستا رہا۔ ہولے ہولے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آہستہ آہستہ گالوں پر بہنے لگے۔ اس کے باپ نے ساری عمر آدرشوں سے بڑی محبت کی تھی۔ اخوت کا سبق —— حب الوطنی کا سبق —— ایثار و محبت کی تعلیم دی تھی۔ ان آدرشوں کی کمزور محبت پتہ نہیں کن راستوں سے سفر کر کے اس تک آ گئی تھی۔

وہ ہولے ہولے ہنستا رہا اور آنسو اس کی گالوں پہ بہتے رہے۔

"دادی ماں —— یہ بات تمھارے ذہن میں آئی کیسے —— یہ خواب تو نسیم نے بھی کبھی نہیں دیکھا ہو گا"۔

"اس نے یہ خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، تُو نے ضرور دیکھا ہو گا۔ مردوں کی ایسی ہی مت ہے۔ تُو کونسا اپنے باپ سے کم ہے!"

ابراہیم بڑے اینٹھے پن سے اٹھا اور تیسری منزل پر جا رکا۔

دادی بے چاری آنسوؤں کے ایک ہی معنی جانتی تھی۔ محرومی —— نارسائی —— آرزومندی —— دادی کے انڈ و دھیان سے بھی پرے تھا کہ کبھی کبھی ایسے آنسو بھی آ جاتے ہیں جو دوسروں کی آنکھوں سے مستعار لیے ہوتے ہیں۔ ابراہیم جو گہرے کرب سے جھلا جھل رو دیا تو وہ اپنی محرومیوں کے آنسو نہ تھے بلکہ یہ وہ منجمد آنسو تھے جو آج تک نسیم اپنی حالت پر بہا نہ سکی تھی۔ جو دھمو اور منظور کی آنکھوں میں کبھی کے سوکھ چکے تھے۔

ابراہیم لمحے کا آدمی تھا۔ اسی لیے اس نے فیصلہ بھی اسی لمحے کیا کہ وہ پھر منظور کے

گھر نہیں جانے گا۔ اس کی وجہ کچھ یہ نہ تھی کہ وہ دادی سے بدکتا تھا۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی نہیں تھی کہ اب وہ نسیم کا بننے سے انکاری تھا — بلکہ یکدم اس پہ یہ حقیقت کھلی تھی کہ اگر بدنامی کی باتیں کسی طور پر کسی موسمی پھل کے ساتھ ساتھ بوڑھی دھموں کے کانوں میں جا پہنچیں تو اس آسیب دیدہ عورت کا کیا بنے گا۔ ایک قیامت آ جائے گی — حویلی میں نہیں — منظور کے گھر میں بھی نہیں — بلکہ ملک ابراہیم کی ذات میں۔

اس کی طرف وہ ایک بار بلاوا آیا۔ کبھی کبھی منظور کے ساتھ گلی میں ٹاکرا بھی ہو جاتا لیکن اس نے اس پالان کو دوبارہ اپنی پیٹھ پر نہیں لادا — اس بندر آشنائی سے جو کھو دھموں کے خاندان کو ہوا ہو گا وہ ایک اور دکھ بھری کہانی ہے جو انسانی دلوں پہ گزرتی ہی رہتی ہے لیکن دادی کے ایک ہی دیکھے سے ابراہیم کی عزت بحال ہو گئی اور اس کی گرانڈیل مینا وتی جیسی ماں نے سکھ کا سانس لیا۔

کئی سال گزرنے پر اس شام ایک فیصلہ کن واقعہ اور ہوا۔

شہ نشین پر کھڑے ہو کر اس نے حضرت امام حسین کے گھوڑے کو دو گلی پیچھے امام باڑے سے نکلتے دیکھا تھا۔ صندلی خوبرو جوان، سیاہ لباسوں میں، دیوانہ وار ساتھ جا رہے تھے۔ سب کی آنکھوں سے ایسے آنسو رواں تھے جنہیں دادی نہیں جانتی تھی۔ ساری گلی میں پاؤں ٹکانے کی جگہ نہ تھی۔ امام باڑے سے اندھی شام میں بین کرنے والوں کی آہ و بکا زخمی ہو کر اوپر شہ نشین تک آ گئی تھی۔ گلی میں کوئی کوئی گھر روشن ہو گیا تھا لیکن بجلی کے کھمبوں پر روشنی نہ ہوئی تھی۔ کوٹھوں پہ عورتیں دوہری بکلیں مارے ایک اور عہد میں زندہ دم بخود گردنیں جھکائے نیچے گلی میں دیکھ رہی تھیں۔

ہوا میں گرمی تھی سانسوں کی — آہوں کی — آدرشوں کی — ایک بیتی گھڑی کے سوگ کی پکار ہر طرف پھیلی تھی۔ انسان کو اگر پوری طرح خوشی راس آ بھی جائے تو بھی وہ غم کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ کئی غم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ذاتی خوشی یا اس

کے فقدان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا — اندر ہی اندر یہ شفا بخشنے والا غم روح کو اجلا کرتا ہے۔۔۔۔ حضرت مسیح کا سوگ۔۔۔۔ کربلا کے واقعہ کا بین۔۔۔۔ دیوارِ گریہ کے آنسو۔۔۔۔ مہارانی سیتا کے بن باس کا غم۔۔۔۔

لیکن دادی کیسے سمجھ سکتی تھی کہ انسان نے اپنی تمام خوشیوں کے اوپر غم کا سائبان تان رکھا ہے — اور وہ اس سائبان تلے آنند کی گھڑیاں گزار سکتا ہے۔

پھر غمِ حسینؓ میں سال بھر کے لیے شفایاب ہونے والے اس کی گلی میں سے گزرنے لگے — شام ہو چکی تھی لیکن ابھی تک ہوا میں جھلس دینے والی گرمی تھی — تمام لوگ گرمی اور کچھ آدرش کے غم میں نڈھال تھے۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں۔ بالوں میں دھول تھی — تمام ماتم کناں پیاسے تھے۔

ابراہیم شہ نشین پر ٹانگ دھرے نیچے دیکھ رہا تھا لیکن وہ لمحے کا آدمی تھا۔ ثانیے کی سوچ کے تابع تھا۔ وہ ننگے پاؤں نچلی منزل میں پہنچا۔ گھر خالی اور سنسان تھا۔ اس نے جگ میں ٹھنڈا پانی انڈیلا اور آنسوؤں کے سواگت کے لیے گلی میں پہنچ گیا۔ وہ کئی بار جگ لایا اور کئی جگ لایا۔ لوگ آہستہ آہستہ گھروں کو رخصت ہو گئے۔ کھمبوں کے بلب جل اٹھے۔ عورتیں کوٹھوں سے اتر گئیں اور شامِ غریباں کا نوحہ امام باڑے سے آنا بند ہو گیا۔ ترساں و خیزاں کئی جوان گلی میں سے آہیں بھرتے چلے گئے۔۔۔۔ لوگوں کی گنجار کسی دوسری گلی میں منتقل ہو گئی لیکن ابراہیم بغلی پھاٹک کے سامنے اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اسے دادی اماں کا بلاوا نہ آ گیا۔

وہ پانی کے جگ سمیت اوپر گیا —

دادی کے بوڑھے ہونٹوں پہ تازہ پان کی سرخی تھی اور اس کے ابروؤں کے درمیان غصے کی بھاری لکیر تھی۔

"تجھے کیا ہو گیا ہے ابراہیم —"

وہ چپ چاپ ہانپتی بیٹھ گیا اور دادی دیر تک بھینس کی طرح منہ ہلاتی رہی۔

"تجھے ہوا کیا ہے؟"

"کیا ہوا ہے مجھے؟"

"کبھی ایسے ہوا ہے پہلے؟"

"کیا نہیں ہوا دادی؟"

"تجھے ذرا بھی ملکوں کی عزت کا پاس نہیں؟ — یہ سوشل سروس نہیں ہے ابراہیم تُو اپنی انا کی تسکین کر رہا ہے غلط طریقوں سے — تیرا باپ دودھ کی سبیل لگواتا تھا دسویں کو۔ ہمارے ہاں سے جو ختم دلایا جاتا ہے اس کا کوئی مقابلہ ہے — لیکن اپنے ہاتھ میں جگ پکڑ کر پانی پلاتے پھرنا — توبہ —!"

"غم کی پذیرائی کے لیے خود نہ نکلا دادی ماں — خشک چہروں کے لیے تھوڑا سا پانی اپنے ہاتھوں میں لے کر نہ جا سکا — میں تو انسانوں کے سانجھے دکھ کو سلام کرنے نکلا تھا دادی —"

"میں — میں کیا کہوں اب۔ لاکھوں خرچ کیے تیرے باپ نے، ہزاروں گھر بسانے پر نہ اپنا مسلک کبھی چھوڑا نہ کسی اور کا چھیڑا — اس نے بھی بنی نوع کی بڑی خدمت کی تھی — پر تیری طرح اپنی ذات کے غبارے میں گیس کبھی نہیں بھری تھی — یہ سب کیا سمجھتے ہوں گے گلی والے — معمولی لوگ — ان سے تو ہماری بول چال بھی نہیں ہے — تُو نے اپنے ہاتھوں سے انہیں پانی پلایا — توبہ توبہ — تجھے ہر اُلٹے کام کا کتنا شوق ہے ابراہیم —"

"میں جا رہا ہوں دادی اماں — آپ کا وطن چھوڑ کر — میں ایسے حالات میں اب یہاں ایک منٹ نہیں رہنا چاہتا —"

"کیوں — کیا ہوا ہے تمہارے وطن کو؟ — جنگ چھڑ گئی ہے؟ — سیلاب آگیا ہے؟ کوئی اندرونی فسادات شروع ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے بھاگ رہے ہو"۔

"جہاں خاکروب کو آپ کی ناپاکی صاف کرنے کے ساتھ ساتھ نفرت کا صلہ بھی ملے۔ جہاں ستر سالہ تائب طوائف کو پاکیزگی کا بوجھ اور عبادت کی سختی بھی جھیلنا پڑے اور کنجری کی نحیف صدائیں بھی اس کے نحیف وجود کو شبلیق رہیں۔ جہاں بہتر فرقے بآوازِ بلند پکاریں کہ مسیحِ موعود آنے والے ہیں مگر ایک تہتر واں فرقہ اگر کہہ بیٹھے کہ وہ آ چکے ہیں تو اقلیت —! یہاں میں نہیں رہ سکتا دادی ماں۔ نہیں رہ سکتا — ہمارے معاشرے میں غریبی گالی، بیٹی بوجھ — ذات پات عین دین ہے دادی ماں — میں کسی ایسے ملک میں چلا جاؤں گا جہاں کا نہ معاشرہ میرا ہو گا نہ اس کا قانون میں نے تشکیل دیا ہو گا — وہاں میں صرف اپنے گناہوں کا جوابدہ رہوں گا اگر جرم کروں گا تو صرف خود سزا پاؤں گا — گمراہ ہوں گا تو اکیلا میں اس معاشرے کے گناہوں اور جرائم کی شرمساری اپنی گردن پر لے کر مرنا نہیں چاہتا۔ چلیے آپ مجھے بزدل کہہ لیں — ایسا ہی ہے — میں اگر اس تنگ نظر، تنگ اوقات معاشرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو یہاں سے ہجرت تو کر سکتا ہوں؟ — ہجرت تو کر سکتا ہوں! — ہجرت تو کر سکتا ہوں؟"

اصرارات —

جب پچھلی گلیوں سے ابھی بھی رونے کی آوازیں آ رہی تھیں، ابراہیم اپنا سامان باندھتا رہا۔

یہ بھی سنا گیا ہے کہ ملک ابراہیم جب ایک بار سوئٹزرلینڈ چلا گیا تو اس نے حویلی والوں کو پلٹ کر کوئی خط نہیں لکھا۔ اس کی ماں جس کا ٹھٹ سنگھ ساری حویلی میں چلتا تھا رانی سیتا وتی کی طرح سارے کمروں میں بَین ڈالا کرتی تھی لیکن اس کا ماتم کچھ اور ہوا کرتا۔ وہ ہر ایک سے کہتی:

"ابراہیم کو تو ابھی میں نے بیاہنا تھا۔ ابھی تو اس کی کوئی خوشی پوری نہ ہوئی تھی پھر

وہ کس لیے ماں کو چھوڑ گیا ——— کس لیے اس نے جلاوطنی اختیار کی؟ ——— اس کے چندن سے بدن نے کوئی سکھ نہیں دیکھا ——— کیا کرتا ہوگا پردیس میں میرا ابراہیم؟

لیکن جب آدمی اپنے آدرشوں کو نہ تحریکوں میں ڈھال سکے نہ قدم قدم ان کے ساتھ چل سکے تو پھر جوگ لیے بغیر اور کونسا چارہ رہ جاتا ہے؟ کہتے ہیں جس روز راجہ گوپی چند نے ملکوں کی حویلی سے نکل کر جوگ لیا اور کرم بھوگ پورا کر لیا، اس رات ہلکا سا زلزلہ لاہور شہر میں آیا تھا ——— باقی شہر تو سلامت رہا صرف منظور کے گھر کی چھت گر گئی اور اس کے ملبے تلے کرسی سمیت نسیم دفن ہو گئی ———

حویلی والوں کا بیان ہے کہ حویلی میں زلزلہ محسوس تک نہ ہوا ——— صرف آنگن میں بنی ہوئی ملک ابراہیم کے باپ کی قبر میں ایسا شگاف آ گیا تھا جس سے آہستہ آہستہ پانی رِستا رہتا تھا!

قطرہ قطرہ ———

بوند بوند ———

آنسو آنسو ———

چھمو

میں نے اسے پہلی بار بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی دیکھا تھا اور بیگم صاحبہ سے میری ملاقات ایک دن اتفاقاً ہو گئی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ ہم سب سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ گرمیوں میں یہ تیاریاں بڑی طول طویل ہوتی ہیں۔ بستر باہر نکالے جاتے ہیں۔ گھڑوں میں پانی بھرا جاتا ہے۔ پنکھوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مسہریاں تانی جاتی ہیں اور پھر بھی نیند ہے کہ کسی خوش قسمت ہی کی آنکھوں میں بسرام کرتی ہوگی۔

میں اپنا دوپٹہ بانہوں پر لپیٹے پڑی تھی کیونکہ مچھروں کا دستہ بار بار یورش کر رہا تھا اور گرمی کا یہ عالم تھا کہ چادر اور مسہری میں دم گھٹتا تھا۔ اسی قریب ہی جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پنکھی اٹھا لیتیں۔ دوپٹے سے گردن پونچھتیں اور پھر بڑی بد دلی سے سر جھکا کر نماز پڑھنے لگتیں ——— یہ وقت کسی کو ملنے کا نہ تھا لیکن کبھی کبھی اچانک کسی ایسے انسان سے ملاقات ہو جایا کرتی ہے جیسے کوئی سیارہ گھومتا پھرتا آپ کے محور پر آ نکلا ہو۔

کار کی بتیاں پھاٹک پر لہرائیں پھر انجن بند ہو گیا اور پھر اپنا آپ دھکیلتی ہوئی کار پورچ

میں کھڑی ہو گئی۔

میں اپنا پھٹا ہوا دوپٹہ بازو پہ لپیٹتے ہوئے اٹھی اور سیلی لان پہ آہستہ آہستہ چلتی پورچ کی طرف چل دی۔ آپی کار سے باہر نکل کر کھڑی تھیں لیکن ابھی تک وہ شیشے میں منہ دیے اندر کسی سے باتیں کیے جا رہی تھیں۔ ان کا متوازن، بھرا ہوا جسم ساڑھی میں نمایاں نظر آ رہا تھا اور اونچی ایڑی کے باعث وہ بہت لمبی لگ رہی تھیں۔

'بالی! — دیکھو تمہیں کون ملنے آیا ہے؟'

'کون آیا ہے؟ —' میں نے سرگوشی کی۔

کار سے کوئی بھی برآمد نہ ہوا اور چونکہ شیشوں پر سبز پردے تھے اس لیے میں کچھ بھی اندازہ نہ کر سکی کہ اندر کون ہو سکتا ہے؟

"بالی! — پہلے پردہ کروا لو۔ پھر یہ نکلیں گی۔" آپی بولیں۔

"لو بھئی آپی! یہاں کون ہے۔ کمال کرتی ہیں آپ بھی!" میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر کہا۔

"پھر بھی دیکھ لو۔ کوئی نوکر بھی نہ ہو۔"

میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اندھیرے میں ایک ہیولے سے بولی: 'بے فکر رہیے یہ جگہ آدم بو سے پاک ہے۔'

اندر سے کپڑے سرسرانے کی آواز آئی تو بے چارہ ڈرائیور منہ لٹکا کر چل دیا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ عورتوں کے قلب کی حرکت بڑھ جاتی!

'وہی بیگم صاحبہ ہیں جن کا ذکر میں نے تم سے کیا تھا۔' آپی نے آواز لگا کر مجھ سے تعارف کروایا۔

'اچھا آ — آ —' میں ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔

بیگم صاحبہ نکلیں۔

ان کا ہجوم ان کی امارت کی گواہی دیتا تھا۔ ان کے کپڑوں میں نفاست تھی اور زیور گو پرانے فیشن کا تھا لیکن جس تکلف سے انھوں نے پہن رکھا تھا، یوں لگتا تھا گویا ابھی دکان سے آیا ہے۔ ان کی چال مدھم، لب و لہجہ شیریں اور گفتگو دھیمی تھی۔

آپی نے باہر ہی بیٹھنا مناسب سمجھا، سو ہم سب بستروں کی طرف چل دیے۔ بیگم صاحبہ بڑے تکلف سے ایک کرسی پر بیٹھ گئیں اور ہم دونوں حسبِ عادت چارپائیوں پر نشست جما کر بیٹھ رہیں۔

چارپائیوں پر بیٹھنا ایک فن ہے۔ ہماری آدھی زندگی ان ہی پہ گزرتی ہے اور جو آدھی باقی رہ جاتی ہے اس کا چوتھا حصہ بھی ہم ان ہی پر لیٹ کر، بیٹھ کر، کروٹیں بدل کر کاٹ دیتے ہیں۔ — چادروں پر سالن کے داغ ہوتے ہیں۔ سیاہی کے دھبے ہوتے ہیں۔ مٹی اور دھول کی افشاں ہوتی ہے اور تکیوں پر نہ صرف تیل ہی کا بڑا سا چھاخ نظر آتا ہے بلکہ عموماً آنسوؤں کی ہلکی سی نمی بھی داغ چھوڑ جاتی ہے

چارپائیاں اور بستر ہمارے کلچر کی ایسی رسیدیں ہیں جن پر ان گنت لوگ مہریں ثبت کرتے ہیں۔ ان پر بیٹھنا آسان نہیں ہوتا۔ پیٹ میں کئی بل پڑ جاتے ہیں۔ ٹانگیں تھوڑی دیر بعد یقیناً سو جاتی ہیں اور آدھ گھنٹے کی بیٹھک میں کئی پینترے بدلنے پڑتے ہیں کندھے جھکے رہتے ہیں اور گردن میں خم پڑ جاتا ہے — لیکن جو چارپائیوں کے عادی ہیں انہیں کرسیوں میں کبھی سکون نہیں ملا۔

'بالی! بیگم صاحبہ کئی دن سے کہہ رہی تھیں لیکن آج جانے انہیں کیا سوجھی کہ ارادہ کرتے ہی چل پڑیں۔'

'بڑی نوازش ہے ان کی۔' میں نے جواب دیا۔

'نوازش کاہے کی؟ ہم تو آپ جیسے لوگوں کی زیارت کو بڑی دور دور سے

آتے ہیں و۔ بیگم صاحبہ بولیں۔
اس جملے میں نہ تو سچ تھا نہ ہی بناوٹ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ انہیں ایسے جملے ادا کرنے کی عادت تھی۔

"ہاں! نواب صاحب سے اجازت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے"۔ آپی نے ابرو اٹھا کر بات کی۔

"نہیں جی یہ — نواب صاحب تو کچھ نہیں کہتے۔ میں نے ہی کبھی اصرار نہیں کیا"۔

"چلیے۔ ہمارے ہی بھاگ بھلے ہیں کہ آپ نے زحمت گوارا کی"۔
جب امی اٹھیں اور باتوں میں روانی آگئی تو میں نے بیگم صاحبہ کا غور سے جائزہ لیا — !

ان کی موٹی موٹی آنکھیں شربتی تھیں اور انہیں ان کے پھیلانے اور ادا سے بند کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ بات کرتے ہوئے بڑے آرام سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتیں، نگاہوں کو جھکاتیں اور پھر ذرا سا گردن کو خم دے کر اپنے جملے کے آخری الفاظ بالکل مدھم کر دیتیں۔

بیگم صاحبہ اپنی جوانی میں بڑی قاتلہ ہوں گی۔ وہ چنٹ کیے ہوئے دوپٹے اوڑھتی ہوں گی۔ کمر پر کسی ہوئی پشوازیں پہنتی ہوں گی۔ ان کی چال میں ٹھوکریں اور ان کی باتوں میں حلاوت کھجوروں کا رس ہو گا! — اب بھی جبکہ ان کا بڑا لڑکا فسٹ ایئر میں پڑھ رہا تھا اور چھوٹا لڑکا جاجی چوتھی میں تعلیم پا رہا تھا ان کی آن بان ایسی تھی گویا کسی نئی نویلی دلہن کو اس کے شوہر کے بیجا لاڈ پیار نے بگاڑ رکھا ہو۔

شربت کا گلاس ہاتھ میں گھماتے ہوئے انھوں نے آپی سے کہا:
"دیکھیے۔ میری نوکرانی اور اس کی بچی کار میں بیٹھی ہیں۔ انہیں بھی بلا لیجیے"۔
جب نوکرانی آئی تو ساتھ رینگتی ہوئی چھتو بھی آئی۔

اگر بیگم صاحبہ ہمارے ہاں نہ آتیں تو میں اس چھتو کو کبھی نہ مل سکتی جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا، نسوانیت نے بچپن کا روپ دھار رکھا ہے۔ چھتو چار سال کی بچی ہو گی۔ اس کی آنکھیں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ رہی تھیں۔ اس کا دہن یوں کھلا تھا، جیسے کوئی ٹرنک بند کرنا بھول گیا ہے — یہ دہن شاید ہمیشہ ہی سے کھلا تھا۔ دونوں جانب ہونٹ لٹکے ہوئے بھنگی کے سر سے بوجھ سے بوجھل۔ اس کی چال میں بچوں کی بے سمجھی نہ تھی بلکہ نسوانیت کا سا عزم تھا۔ میں نے بہت سی بچیاں دیکھی ہیں لیکن چھتو چھتو ہی تھی۔ میں نے معصومیت اور کچے پن کا ایسا مجموعہ پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے بوسیدہ امریکن فراکوں میں سے بنایا ہوا لمبا گرتا پہن رکھا تھا جو ٹخنوں تک پہنچ کر کونوں سے یوں اٹھا ہوا تھا کہ دونوں جانب فراک نما گولائیاں ابھر آئی تھیں۔ اس کے ناخنوں پر پرانی پالش تھی۔ بالوں میں ربن کی جگہ ایک کترن سی اٹکی ہوئی تھی اور کانوں میں ذرا ذرا سی سونے کی بالیاں تھیں۔ چھتو کو دیکھ کر کسی ایسی بچی کی گڑیا کا خیال آتا جس پر اپنی گڑیا کو سنوارنے کے دورے پڑتے ہوں۔ یوں لگتا تھا کبھی تو چھتو پر نوازشوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں اور کبھی وہ محض ستو نوکرانی کی لڑکی بن کر کونے کھدروں میں چھپتی پھرتی ہے۔ وہ ایک ہی ماحول میں رہنے کے باوجود کچھ جھنجھوڑی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آج تو وہ بیگم صاحبہ کی گود میں ہمکتی ہے اور کل میراثن کی گندی بچی کے ساتھ باسی ٹکڑوں پر پھینک دی جاتی ہے۔ شاید اسی قسم کے رویے نے اس کی آنکھوں میں ایک مستقل سوال چھپا رکھا تھا۔ وہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر ایسا تالاب یاد آتا جو پاتال تک گہرا ہو اور جس میں دور تک درخت ہی درخت کانپتے ہوئے نظر آئیں۔ ان ہی آنکھوں کو پورا کھول کر وہ پوچھتی تھی میں کون ہوں؟ — بولو نا۔ میں کون ہوں؟

ستو نوکرانی تو بالکل بے لیپ کا کوٹھا نظر آئی۔ چھتو کو اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی۔
میں نے مسکرا کر اسے بلایا تو وہ ہاتھ سے باندھے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے ہاتھ پھیلایا تو وہ

میری طرف رینگنے لگی ۔ شاید وہ التفات کے معنی جانتی تھی۔

'کہو چھتو! پڑھتی ہو ؟' میں نے اس کے گرد آلود سنہری بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

چھتو نے دائیں بائیں بڑا سا سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

'کیا نام ہے چھتو ؟'

چھتو نے پہلے ماں کی جانب دیکھا۔ پھر بیگم صاحبہ کی طرف اپنی نگاہیں اٹھا کر سر جھکا لیا۔

'کیا نام ہے چھتو۔ بتاؤ ناں نسیم بانو ___ ' ستو بولی۔

مردار مچھلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

'نسیم بانو نام ہے کیا ؟' میں نے چھتو سے پوچھا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

'نسیم بانو اس کا نام میں نے رکھا ہے۔ اس ستو نے تو زینب بی بی رکھا تھا لیکن میں نے کہیں پکار دیکھا تو تب سے میری تمنا تھی کہ کسی لڑکی کا نام نسیم بانو رکھوں ___ مجھے تو اللہ میاں نے لڑکی دی نہیں اسی لیے میں نے اس کا نام رکھ لیا ہے ۔ کیوں بالی ! بے نا وہی صورت ؟' ___ بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

'جی ! ___ بڑی پیاری صورت ہے ۔' میں نے بیگم صاحبہ کا جی رکھنے کی خاطر کہہ دیا لیکن میں چھتو کی صورت سے متاثر نہ ہوئی ___ چھتو اگر خوب صورت بچوں میں گھری ہوتی تو بھی قابلِ توجہ ہوتی ۔ اس کی وجہ اس کے بھورے بال نہ تھے۔ اس کی وہ آنکھیں نہ تھیں جن میں قدرتی سرمے کی تحریریں بکھری تھیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ چھتو ، اپنے لیے ایک معمہ تھی اور وہ یہ معمہ ہر ملنے والے کو اسی خلوص سے پیش کرتی تھی جس خلوص سے وہ حیات کی ڈگر پہ گامزن تھی ___ وہ بیگم صاحبہ کی کائنات میں اپنا مقام پیدا کرتی ہوئی

الجھ گئی تھی اور اسی لیے پوچھتی پھرتی ___ میں کون ہوں ؟ ___ میں کون ہوں ؟ ___ اس کا وجود مجسم سوال بن کر پوچھتا اور دہن مایوس ہو کر کھل جاتا اور کہتا ___ کوئی نہیں جانتا! ___ کوئی نہیں جانتا !!

'منہ بند کرو چھتو رانی ۔' ___ میں نے اس کے دہن کو دونوں انگلیوں سے بند کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے اس کے ہونٹ آپس میں پیوست رہے اور پھر آپ ہی آپ بغیر گوند کے لفافہ کی طرح کھل گئے ۔

'منہ بند رکھو ناں ___ ' ستو للکاری ۔

'پتہ نہیں اس کا منہ کیوں کھلا رہتا ہے ___ پتہ ہے آپی! یہ پچھلے سال گر گئی تھی ۔ سر سے گھنٹوں لہو جاری رہا۔ میرا خیال ہے اسی کی وجہ سے سر کمزور ہو گیا ہے۔ باتیں تو بہت کرتی ہے لیکن وہ پہلی سی تیزی نہیں رہی ___ ' بیگم صاحبہ بولیں۔

'ہاں سائیں! کبھی کبھی مجھے بھی شبہ ہوتا ہے کہ بات سمجھ نہیں رہی ۔' ستو نے ماں کے تردد بھرے لہجے میں کہا۔

'خیر ڈاکٹر کے پاس کل بھجوائیں گے ___ لیکن کیسی جیتی جاگتی آنکھیں ہیں ___ ' آپی بولیں۔

یہ چھتو سے میری پہلی ملاقات تھی۔

دراصل یہ ملاقات بیگم صاحبہ کے طفیل ہوئی ، اس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں اور بیگم صاحبہ سے ملنا آپی کی بدولت ہوا۔ آپی اور ان کا بہت گہرا بہناپا تھا ۔ اسی لیے انہیں مجھے دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور میں انہیں ملنے کی مشتاق ہوئی ۔

بیگم صاحبہ اپنے کالے کلوٹے نواب صاحب کی چہیتی بیوی تھیں۔ ان کے حرم میں اَن گنت نوکرانیاں تھیں۔ ان کے سکھ کے لیے ہر ایک ہاتھ باندھے پھرتی تھی ۔ صحن میں نواب صاحب

نے بجلی کا پنکھا لگوا رکھا تھا۔ سارا سارا دن چھڑکاؤ ہوتا۔ ذرا وہ کروٹ بدلتیں۔ ہائے کرتیں تو ڈاکٹر کے لیے گاڑی روانہ کر دی جاتی —— ذرا ان کا جی پریشان ہوتا تو نواب صاحب دبے پاؤں قریب آتے۔ پھر پاس بیٹھ کر پہروں درود پڑھتے اور پانی دم کر کے بس ایک گھونٹ پی لینے پر اصرار کرتے نظر آتے۔

انہیں اپنی چہیتی بیوی سے بہت محبت تھی۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی ستو اور کبھی میراثن کے ہاتھوں میں اچانک سونے کی انگوٹھیاں جھلملانے لگتیں۔ ان کے بدن پہ ریشمی بنیانیں اور بالوں میں پلاسٹک کے کلپ جگمگاتے اور وہ کسی منہ زور گھوڑی کی طرح بے قابو ہو جاتیں —— لیکن ان گستاخیوں کے باوجود نواب صاحب متھار کر بیگم صاحبہ سے کہتے:

"چلو اپنی رعیت ہے۔ گھر سے کیا نکالیں!"

لیکن ایسے واقعات بہت کم ہوتے تھے اور ایسی بدنظمی عموماً تب پھیلتی جب بیگم صاحبہ میکے چلی جاتیں یا ہسپتال میں ہوتیں ورنہ زنانے میں بیگم صاحبہ کا راج تھا۔ یہاں کے اصول وہی مرتب کرتی تھیں۔ یہاں نہ کوئی پردھان منتری تھا نہ صلاح کار۔ سب کچھ بیگم صاحبہ تھیں اور خوب تھیں۔

چند دنوں بعد آپی کے اصرار پر بیگم صاحبہ کے نیاز حاصل کرنے گئی۔

اونچی اونچی قلعے ایسی دیواروں کے پاس کار رک گئی۔ بڑا سا لکڑی کا پھاٹک آدھا کھلا تھا۔ دہلیز آمد و رفت کے باعث گھس چکی تھی اور کنڈی زنگ آلود تھی۔

آپی بے پروائی سے گزریں تو دہلیز میں لگے ہوئے ایک کیل میں ان کی ساڑھی الجھ گئی۔ پرانی عمارتیں اپنا آپ منوائے بغیر آگے جانے نہیں دیتیں۔

میں نے اس چھوٹی سی ڈیوڑھی پر نظر ڈالی۔ جگہ اندھیری تھی سیلی تھی اور حبس اس کی دیواروں میں مقید تھا۔ چارپائی پر بیٹھی ہوئی ملازمہ کا چہرہ مکڑی کا جالا بن چکا تھا۔ اس

کی ہنسلی کی ہڈی پھٹے ہوئے کُرتے سے جھانک رہی تھی اور بوسیدہ کمزور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

اس نے آپی کی طرف دیکھا، مسکرائی اور بولی:

"بیگم صاحبہ سے ملنا ہے سائیں؟"

"ہاں —" آپی آگے بڑھتی ہوئی بولیں۔

"میں ساتھ چلوں"۔ اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ بیٹھی رہو"۔

بیگم صاحبہ ایک بڑے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ اوپر بجلی کا پنکھا چل رہا تھا اور پائنتی ستو بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی۔ صحن کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ پھاندنے کے لیے تو بہت اونچی تھیں لیکن سر پھوڑنے کے لیے بہت موزوں —— پکی اینٹ اور سیمنٹ سے بنی ہوئی ان دیواروں کو دیکھ کر کسی ایسے ریچھ کی بانہوں کا خیال آتا تھا جو بستے گھر میں سے کسی عورت کو اٹھا کر لے جاتا ہے اور پھر اس کے پاؤں چاٹ چاٹ کر اسے محصور کر لیتا ہے۔ ان بانہوں کی گرفت سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ محراب دار کمروں میں اندھیرا تھا۔ دروازوں میں کوئی شیشہ نہیں تھا۔ اونچے اونچے لکڑی کے تختے آپس میں یوں بھڑے ہوئے تھے گویا مرگی کے مریض کے دانت بھنچ کر رہ گئے ہوں۔ برآمدہ نما لمبے سے کمرے کے سامنے بیری کا درخت تھا جس کی پروان کسی آزاد فضا میں نہ ہوئی تھی بلکہ جسے کانٹ چھانٹ کر اس صحن کے قابل بنایا گیا تھا۔

پکے فرش، پکی دیواریں، پکے حجرے، پختہ دروازے، چھوٹی سی کانٹے دار بیری، اور ان سب میں ملکہ وکٹوریہ ایسی عظیم بیگم صاحبہ، کوئی راہِ فرار نہیں۔ کوئی گریز کا راستہ نہیں۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ پانی کا بہاؤ روک لو تو وہ اپنا رُخ بدل لیتا ہے لیکن بہاؤ جاری رکھتا ہے۔ اسی حرم سے تین لڑکیاں بھاگ چکی تھیں اور اسی حرم کے متعلق سنا تھا کہ رات کے وقت

عورتیں ڈولیوں میں بیٹھ کر چوری چوری حویلی سے نکلتیں اور صبح جب وہ پلٹتیں تو ان کے ہونٹوں پر پُراسرار مسکراہٹ، جیبوں میں کھنکتے سکّے اور آنکھوں میں ٹوٹی ہوئی نیند کا خمار ہوتا۔

بیگم صاحبہ کے پلنگ سے کچھ ہی دُور اسی بیری تلے میں نے چھتو کو سر جھکائے دیکھا وہ اپنے ہم عمر بچوں سے بہت دور الگ تھلگ کھڑی تھی۔ چھتو کو بچوں کے کھیلوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ تو پاؤں کے انگوٹھے سے فرش رگڑتی ہوئی بہت دور کی سوچ رہی تھی۔ آج اس کے بال کسی نے بڑے تکلف اور بہت سے بنائے تھے اور ہونٹوں پہ باسی لپ سٹک کی ہلکی سی تحریر باقی تھی۔

"چھتو!___ نسیم بانو! دیکھو ہم تو اتنی دور سے صرف تمھارے لیے آئے ہیں۔" میں نے دلار سے پکارا۔

"سائیں! یہ کرموں جلی ہے ہی ایسی ___ جو دیکھتا ہے مر مٹتا ہے۔" ستو نے بظاہر چڑ کر کہا۔

"اچھی صورت کا کون متوالا نہیں ہوتا ___" ایک بڑی بوڑھی نے لمبی سی سانس بھر کر بات کی۔ ان کی تسبیح کے دانے لمحے بھر کو رک گئے۔ جیسے ماضی کی بھول بھلیوں میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکلے ہوں۔

"ہاں! سبھی اچھی صورت پر جان دیتے ہیں۔ آپی راجے کو دیکھا ہے ناں آپ نے؟ میرا بڑا لڑکا ہے بالی! وہ اس پہ جان چھڑکتا ہے۔" بیگم صاحبہ بولیں۔

"اب لڑکا کہاں لگتا ہے۔ اچھا خاصا معتبر بھائی بن گیا ہے۔" آپی نے کہا۔

"جب بھی اندر آتا ہے چھتو سے باتیں شروع کر دیتا ہے۔ اس کے لیے ربن لاتا ہے۔ کلپ لاتا ہے اور جانے کیا کیا کرتا رہتا ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

ستو میز پہ برف اور شربت سے لدا ہوا جگ رکھ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ ذرا سا لرزا اور شربت چھلک کر میری جانب لپکا۔

"شوہدے کسی کام لائق نہیں ہوتے نالائق۔ آپ کے کپڑے تو خراب نہیں ہوئے!" بیگم صاحبہ نے قہر آلود نظروں سے ستو کی جانب دیکھ کر بڑی لجاجت سے کہا۔

"نہیں نہیں۔" میں جلدی سے بولی۔

ستو نے تشکر آمیز نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر گیلا میز پوش گلاسوں کے نیچے سے نکالنے لگی۔

"دیکھیے ابھی پرسوں کی بات ہے راجا یہاں بیٹھا تھا۔ چھتو اس کے گھٹنے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ راجے نے پوچھا ___ "بھلا میں تیرا کون ہوں چھتو ___؟" بیگم صاحبہ نے مسکرا کر بڑے انداز سے بات کی۔

ستو قریب ہی کھڑی شربت ڈال رہی تھی ایک دم بولی:

"آ زینب! ذرا پانی ڈال۔ میرے سر میں درد ہے ___ آ ___"

"پھر ___؟" آپی نے پوچھا۔

"چھتو بولی۔ "بابا" ___ راجے نے ہلکی سی چپت ماری اور بولا۔ "یوں نہیں کہا کرتے۔ سُنا۔ بول میں تیرا کون ہوں؟" ___ چھتو پھر بولی۔ بابا!"

"اچھا۔ بابا کہتی ہے راجے کو؟" آپی نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔ دیکھو تو سہی۔ اور وہ تو آپ بچہ ہے ابھی۔ بھلا اس کا باپ کیونکر ہوا ___ نواب صاحب قریب ہی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ 'رعیت اولاد ہی ہوتی ہے۔ پھر کیا ہوا۔ بابا کہتی ہے تو کہنے دو' ___ نواب صاحب بھی کبھی کبھی بڑی بھولی باتیں کرتے ہیں۔"

جب بیگم صاحبہ نے بقول ان کے زبردستی ہمیں دال ساگ کھانے کے لیے رکھ لیا اور ہمیں مرغن کھانوں سے لدے ہوئے میز پہ لا بٹھایا تو میں نے دیکھا۔ چھتو بیگم صاحبہ کے پیروں کے پاس بلّی کے ساتھ بیٹھی ہڈیاں چاٹ رہی تھی۔ شاید وہ ہمیشہ یہیں بیٹھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مفلس بچے کی بھوک نہ تھی۔ محروم بچے کی حرص نہ تھی۔ بس وہی ایک سوال

تھا — میں کون ہوں ؟

میں کون ہوں ؟

جب ہم واپس لوٹے تو رات کافی جا چکی تھی۔ گرمی اور حبس کے باوجود سارا شہر سو رہا تھا۔ گلی کے کُتّے بھی مارے آلکس کے اِدھر اُدھر لیٹے غرا رہے تھے۔ چاند ایک بادل کے چھوٹے سے ٹکڑے سے منہ پونچھتا ہُوا نظر آتا تھا اور اونچے اونچے کھجور کے درخت اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیلا کر ہوا کے لیے جان توڑ رہے تھے۔ کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔

'توبہ۔ ان لوگوں کی زندگی بھی کیا ہے' آپی بولیں۔

'ان کے لیے بہت خوب ہے آپی'۔ میں نے جواب دیا۔

'وہ چھمّو تمہیں بہت پسند آئی ہے ؟' آپی نے پوچھا۔

'وہ بچی ان دیواروں کے خلاف ایک ہلکی سی صدائے احتجاج ہے لیکن یہ صدا اتنی کمزور ہے کہ جلد ہی ڈوب جائے گی'۔

'اچھا پھر وہی افسانوی جملے — ہاں پرسوں ان کی دعوت پہ چل رہی ہو ناں ؟'

'چل پڑیں گے — 'میں نے بددلی سے جمائی لے کر کہا۔

'بھئی ضرور چلنا۔ تمہارے لیے تو میراثنیں بلائی جا رہی ہیں۔ مُجرا ہو رہا ہے — ان کی زندگی بھی خوب ہے۔ مُجرے اور میراثنیں تو اب افسانوں کی باتیں لگتی ہیں لیکن ان کے ہاں ابھی وہی رنگ ڈھنگ ہیں۔ نواب صاحب بھی خوب رنگیلے ہیں اور اب راجا اُن کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے'۔

'جی ؟' میں نے پوچھا۔

'ہاں۔ میں نے سنا ہے چھمّو راجے کی بیٹی ہے اور پھر یہ بھی سُنا ہے کہ ستّو میں نواب صاحب بھی — لیکن خیر — 'آپی نے بڑی شرمساری سے کہا۔ وہ کسی کی بُری بات

بتاتے وقت خود مجرم سی بن جایا کرتی تھیں

میں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

بیگم صاحبہ کی ضیافت پر جانا ہی پڑا۔ اوّل تو ان کا خلوص بھرا اصرار ہی تھا۔ پھر اس چھمّو کے بارے میں جو ایک کرید سی مجھے لگ گئی تھی وہ مجھے بار بار ان کے ہاں لے جاتی تھی بڑی سخت گرمیاں تھیں۔ لُو ہر طرف کسی دیوانی عورت کی طرح بھاگتی پھرتی تھی اور سورج کی آب و تاب تو ایسی تھی کہ ہر ایک چیز کندنی نظر آتی تھی۔

بیگم صاحبہ کے وسطی ہال میں پانچ چھ بڑے بڑے پلنگ بچھے تھے اور ان پہ لحاف اور رضائی جیسی پھولی پھولی عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان کا لباس قیمتی ضرور تھا لیکن اس پھوہڑپن سے پہن رکھا تھا کہ تمام کی تمام بزاز کے گٹھڑ لگتی تھیں۔ پتلی قمیصوں سے نیفے اور پیٹ کی جھلکیاں نظر آتی تھیں اور کھُلے پائنچوں میں اڑسے ہوئے پیر پھٹے ہوئے اور غلیظ تھے۔

کچھ ہی فاصلے پر ایک چارپائی کے ساتھ چھمّو چمٹی ہوئی ایک عورت کی باتیں منہ کھول کر سُن رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور بھی کشادہ ہو گئی تھیں اور لب اور زیادہ لٹک رہے تھے۔

جس عورت میں چھمّو اس قدر دلچسپی لے رہی تھی اس کا جسم متناسب اور رنگت سانولی تھی۔ بالوں کی پٹیاں کانوں سے چپٹی ہوئی تھیں۔ پان کا لاکھا اور لپ سٹک لبوں پر جمی تھی اور سارے دانت پان کے استعمال کے باعث کتھئی نظر آتے تھے۔ اس کے کپڑے تو سادہ تھے لیکن باتوں میں سادگی نہ تھی کیونکہ جب وہ بات کرتی تو قریب ہی قہقہوں کا ننھا سا بھنور اٹھتا اور بڑے بڑے ہیولے ڈولنے لگتے۔ ان آنکھوں میں جسمانی بھوک اتنی دیر رہی تھی کہ اب پردے پڑنے ناممکن تھے۔ اس نے آنکھ مار کر چھمّو سے پوچھا :

'تیرا بابا کہاں ہے چھمّو — !'

چھمّو نے نگاہیں اٹھا کر اس دروازے کی طرف دیکھا جو مردانے میں کھلتا تھا۔

کئی معنی خیز مسکراہٹیں ابھریں اور اسی عورت نے بڑی طرحداری سے کہا :

"چھتو! کیوں اپنے بابا کے پاس کبھی گاؤں نہیں گئی کیا؟"
مسکراہٹیں پھیل کر قہقہہ بن گئیں اور ایک بی بی بولیں ـــ "سنا ہے ستر سے جھگڑا ہو گیا ہے اس کے شوہر کا۔"

میں نے اس عورت کے متعلق بیگم صاحبہ سے پوچھا تو وہ بولیں:

"اب تو کام چھوڑ دیا ہے لیکن پانچ سال پہلے اس کا بڑا کاروبار تھا اور جیسے ہماری ذاتیں ہوتی ہیں نا؟ اور سید ذات سردار ہوتی ہے بالکل ایسے ہی ان لوگوں کی بھی ذاتیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی سردار قوم سے تعلق رکھتی ہے یعنی ہزاروں والی ہے روپیہ اٹھنی والی نہیں ـــ سمجھیں بالی؟"

ہم نے کھانا کھایا تو مجھے چھتو کی تلاش تھی لیکن ایسی افراتفری میں اس کا ڈھونڈنا مشکل تھا۔ میز پر سیروں بھنا ہوا گوشت دھرا تھا تو کرسیوں میں منوں من کچا گوشت لدا ہوا تھا۔ جب میں ہاتھ دھونے کے لیے اٹھی تو میں نے دروازے کے ساتھ چھتو کو ایک ہڈی چباتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت سا لڑکا سفید شلوار قمیض پہنے کھڑا تھا اور صرف بالشت بھر اس سے اونچا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ چھتو کے کندھوں پر تھے اور وہ بغیر باتیں کیے اس کی کشادہ آنکھیں دیکھ رہا تھا۔

وہی عورت پشواز پہن کر اٹھی تو پتہ لگا کہ رشیدہ بائی ہے اور اسی کا مجرا دکھانے کیلیے ہمیں بلایا گیا تھا۔ پاؤں میں گھنگھرو تھے۔ ہاتھوں میں سگریٹ تھا اور آنکھوں میں برسوں کا فنِ پذیرائی۔ قریب ہی فرش پر تین میراثنیں بیٹھی تھیں۔ ایک طبلے پر گیلا آٹا جما رہی تھی اور باقی دونوں آپس میں مشورہ کر رہی تھیں۔

رشیدہ بائی نے کان پر ہاتھ رکھا۔ سگریٹ کا گل جھاڑا اور زمین کو ٹھوکر لگا کر گانے لگی۔ اس کی آواز کھلی اور پاٹ دار تھی۔ ہلکی ہلکی مرکیاں وہ اس خوبی سے ادا کرتی تھی کہ بے ساختہ بڑے بڑے سر ہل جاتے اور عورتیں داد دینے لگتیں۔

میں نے نظر گھما کر اس طرف دیکھا جہاں چھتو کھڑی اب بھی ہڈی چبا رہی تھی۔ وہی چھوٹا سا لڑکا اس کی بانہہ گھسیٹ رہا تھا چند لمحوں بعد یہ دونوں ہماری چارپائی کے ساتھ آ کر کھڑے ہو گئے۔ بیگم صاحبہ نے بچے کے سر پر پیار دیا اور ہولے سے بولیں:

"یہ محمود ایاز کی جوڑی ہے۔ یہ میرا لڑکا ہے بالی! چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے خالہ جان کو سلام نہیں کیا جاجی؟"

لڑکے نے میری جانب دیکھا۔ شرما کر آنکھیں جھکا لیں اور آہستہ سے بولا۔ "کیا تھا جی لیکن انھوں نے سنا نہیں۔"

"آؤ بیٹھو۔" میں نے اس کے لیے اپنے قریب جگہ بناتے ہوئے کہا۔

اس نے میری طرف دیکھا، پلنگ پوش درست کیا اور پھر چھتو کو اٹھا کر میرے ساتھ بٹھا دیا۔ چھتو نے ہولے سے میرے کندھے کے ساتھ اپنا سر لگا لیا اور چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں میں معمولی بچوں کی سی معصومیت آ گئی۔

ہر حرم میں شاید دل بستگی کے وہی سامان ہوتے ہیں۔ یہاں سبھی لڑکیاں شادی سے پہلے گڑیاں کھیلتی ہیں۔ یہاں طوطے پلتے ہیں، ہرنیاں ملول پھرتی ہیں۔ ناچ گانا ہوتا ہے۔ مرغن غذائیں کھائی جاتی ہیں۔ ایک بانکی سی لڑکی نے میرا ہاتھ تھام کر کہا:

"آؤ آپا میں تمہیں اپنی گڑیا کا جہیز دکھا کر لاؤں۔"

جب میں بڑے تردد سے بنایا ہوا جہیز دیکھ کر پلٹی تو رشیدہ بائی کا رنگ خوب جم رہا تھا محفل پر حال کی سی کیفیت طاری تھی لیکن کچھ ہی دور طوطے کے پنجرے کے پاس چھتو اور جاجی ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑے تھے اور جانے کیا سوچ رہے تھے۔ چھتو کا منہ کھلا تھا اور جاجی کی آنکھیں کشادہ ہو کر رہ گئی تھیں۔

یہ بڑا تھکا دینے والا دن تھا اور بڑی لمبی بور کرنے والی دعوت تھی۔ اس کے بعد میں ایک مہینہ بیگم صاحبہ کے ہاں نہ گئی اور اس ماہ کے گزرتے ہی ایّی نے ایک دن آ کر یہ خبر

سنائی کہ ان کا تبادلہ گجرات ہو گیا ہے۔ سامان بٹورتے باندھتے مجھے یہ بھی بھول گیا کہ کوئی بیگم صاحبہ بھی ہیں اور ان کے صحن میں ایک مجسّم معمّہ چھمّو بھی رواں دواں ہے۔

کتنے سارے سال یونہی گزر گئے اور مجھے کبھی آپا کے پاس جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ لیکن پچھلے سال پورے دس سال کے بعد میں آپا کے پاس چھٹیاں گزارنے گئی تو ایک دن وہ مجھے اپنی بیگم صاحبہ کے پاس لے گئیں۔

بیگم صاحبہ کا دیواروں سے گھرا ہوا حویلی نما مکان ویسا ہی تھا۔ اس میں نوکرانیوں کی چلت پھرت اسی طرح تھی۔ وہی مرغن کھانے، وہی بیری کا درخت تھا، وہی آنگن کا پنکھا تھا۔ صرف بیگم صاحبہ کے بال بیشتر سفید ہو چکے تھے اور وہ پلنگ پر لیٹی ہوتی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے گلہ آمیز لہجہ میں کہا:

"یہ آپ کی اچھی بہن ہے۔ کبھی ہماری سار ہی نہیں لی۔"

"جی یہ ایسی ہی بھولن ہار لڑکی ہے مجھے بھی تو خط تک نہیں لکھتی۔"

معاً مجھے چھمّو کا خیال آگیا اور میری نگاہیں اسے تلاش کرنے لگیں لیکن صحن میں ویسی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ کچھ ہی دور ایک پلنگ پر ہماری جانب پشت کیے ایک لڑکی لیٹی تھی لیکن اس نے منہ پر دوپٹہ رکھا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے عرصہ سے اسی پلنگ پر اسی طرح لیٹی ہے۔

باتوں میں گھنٹہ یوں ہی گزر گیا اور شاید بہت سا وقت گزر جاتا اگر کراہنے کی آواز سنائی نہ دیتی۔ دھیرے دھیرے یہ کراہٹ بلند ہوتی گئی۔ پھر اسی لڑکی نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور کروٹیں بدلنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ کروٹیں لوٹنیاں بن گئیں اور اس کے لبوں سے ایک ہی جملہ صدا بن کر نکلنے لگا:

"ہائے میری ماں میں مرتی ہوں — میری ماں میں مرتی ہوں اور تمہیں خبر بھی نہیں —"

اس کے بھورے بال تکیے پر بکھر گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ کسی دیوانی عورت کی طرح ہیبت ناک نظر آنے لگی۔

بیگم صاحبہ نے ناک بھوں چڑھائی اور پکاریں:

"او ستو آ۔ اپنی لاڈو کو دیکھ۔"

ستو آئی۔ میں نے دیکھا وہ عورت وقت سے بہت پہلے بوڑھی ہو چکی تھی۔ خوبصورت تو وہ کبھی تھی ہی نہیں لیکن اب تو کسی جلی ہوئی لکڑی کی یاد دلاتی تھی۔ وہ پلنگ کی پائنتی بیٹھ کر لڑکی کے پاؤں دبانے لگی۔

"ہاں! شاید آپ کو یاد نہ ہو۔ یہ چھمّو ہے۔ اچھی بھلی لڑکی تھی۔ میں تو اپنے ایک مزارعے سے اس کی شادی بھی کرنے والی تھی۔ اب یہ بیمار ہو گئی ہے۔ ہسٹیریا کے دورے پڑتے ہیں — میں تو کہتی ہوں —"

"ہائے ہائے —" میں اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں نے راجا اور جاجی سے صلاح کی تھی۔ کہنے لگے ابھی چند سال پڑی رہنے دو۔ صحت اچھی ہو جائے گی تو بیاہ دینا۔ میں تو ان کی کبھی نہ مانتی لیکن نواب صاحب بھی کہنے لگے۔ پڑی رہنے دو، تمہارا کیا لیتی ہے۔ سب مکر ہے فریب ہے۔ میں جانتی ہوں یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی مُردار۔"

بیگم صاحبہ کے ماتھے پر کئی شکستہ لکیریں پڑ گئیں۔

"کیا جاجی اب بھی اس پہ جان دیتا ہے؟ — پتہ ہے آپ انہیں محمود و ایاز کی جوڑی کہا کرتی تھیں۔" میں نے خواہ مخواہ پوچھ لیا۔

بیگم صاحبہ نے بڑے جلے ہوئے انداز میں کہا:

"یہ کرم جلیاں ہمیشہ اونچی جگہ ہاتھ مارتی ہیں۔ آخر کوئی موری کی اینٹ کو چوبارے سے بھی تو نہیں لگاتا نا؟"

میں چیتو پر جھکی۔

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ماتھا ٹھنڈا تھا۔ نبضیں ٹھیک چل رہی تھیں — میرے ہاتھ کے مس کو محسوس کرتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔

یہ وہی آنکھیں تھیں جو پوچھے جا رہی تھیں:

میں کون ہوں؟ — بولو نا میں کون ہوں؟ —"

واماندگیٔ شوق

پولی میری سہیلی تھی اور ویسے تو پولی سارے کالج کی سہیلی تھی لیکن وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی یا یوں سمجھیے کہ مجھے ہی اس سے محبت ہو گئی تھی۔ اس کی انوکھی طبیعت کو میں سمجھتی تھی اور اگر میں کبھی لڑکا ہوتی تو ضرور پولی سے شادی کر لیتی۔ اس کی تھکی تھکی آنکھوں کو ہر گھڑی گردش کرنے سے بچا لیتی۔ اس کے ذہن سے پرانی یادوں کو دھو ڈالنے کی کوشش کرتی لیکن افسوس میں لڑکا نہ ہو سکی۔

پولا درمیانے قد کی دبلی سی لڑکی تھی۔ صاف کھلتا ہوا گندمی رنگ اور ساٹن کی طرح ملائم جلد اسے چٹی گوری کشمیری لڑکیوں میں بھی ایک امتیازی حیثیت بخشتی تھی لیکن پولی کے پاس سب سے خوبصورت چیز اس کی آنکھیں تھیں جس کی طرف ایک بار اٹھا کر دیکھ لیتی وہی اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ پھر بھی مجھے تعجب ہے کہ کوئی لڑکا اس کے پیچھے دیوانہ نہ ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے اکیلی سائیکل پہ کالج آتی اور ویسے ہی چلی جاتی۔ اس کی یہی شربتی آنکھیں عموماً غمناک رہا کرتیں اور جب کبھی وہ بل کھا کھا کر دیر تک ہنستی رہتی تو اس کی انہی آنکھوں میں ایکا ایکی موٹے موٹے آنسو لرزنے لگتے۔

خوبصورتی میں یوں تو پولی جمیلہ، شاہدہ اور نینا کے پاسنگ بھی نہیں تھی لیکن اس

کے حسنِ ملیح میں ایک عجیب گرفت تھی جو ہمارے کالج کی کسی اور لڑکی کو نصیب نہ ہو سکی۔ ہر حلقے میں پولی کے متعلق مختلف قسم کی گفت گو ہوا کرتی لیکن ہمارے گروہ میں صرف اسی کا چرچا رہتا اور مجھے تعجب بھی ہوتا کیونکہ پولی نہ تو باتونی تھی اور نہ ہی ایسی دلچسپ کہ لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہوتیں۔ وہ نٹ بال کے کورٹ میں نہ تو جیولن پھینک سکتی تھی اور نہ ہی گردن اٹھا کر اور آنکھیں جھپکا کر فلمی نغمے الاپ سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی کالج میں ہر طرف اس کا چرچا رہا۔ اچھا چاہے بُرا۔ اس کا ذکر کالج کی فضا میں کسی تازہ الاپے ہوئے راگ کی مانند گونجتا رہا۔

کالج کے دن جب یاد آتے ہیں تو ہاتھ مل مل کے رہ جاتی ہوں۔ وہ بے فکری اور آزادی اب کہاں۔ وہ لمبے لمبے پروگرام جو ہم مل جل کر بنایا کرتی تھیں، کیا ہوئے؟ وہ سہیلیاں جن کے بغیر دم بھر کو چین نہ آتا تھا، اب مدتوں یاد بھی نہیں آتیں اور زندگی ہے کہ گزرے جاتی ہے۔

بی اے کے امتحان کے بعد ہم رو رو کر جدا ہوئیں۔ ایک دوسری کو خط لکھنے کے باقاعدہ زور شور سے وعدے ہوئے اور دو تین مہینے ان کو نبھایا بھی لیکن رفتہ رفتہ یہ خطوط نویسی ایک زحمت محسوس ہونے لگی اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ کبھی کبھار کسی نہ کسی کی خبر مل جاتی اور ہم مطمئن ہو جاتیں۔

جمیلہ کی شادی ہو گئی اور اس کے ایک دو خطوط سے معلوم ہوا کہ شرمانے کی ادا اس کے نئے روشنی والے خاوند کو بہت بھائی —— میرے ابا جان مست نیند سے چونک اٹھے اور دو مہینوں کے اندر ہی اندر میرا نکاح کر ڈالا —— شاہدہ ایم اے کرنے میں مشغول ہو گئی اور افسوس اس کی زبان کا جادو کسی پر نہ چل سکا۔ پولی اور شکیلہ نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ ایسی روپوش ہوئیں جیسے آنکھوں کا سرمہ۔ ان کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ شادی کے بعد ڈھونڈنے کی فرصت ہی کسے تھی ویسے کبھی کبھی مجھے اپنی ہم جماعتوں کا خیال ضرور آ جاتا۔ یونہی سا خیال اور بس —— اد

میں سوچا کرتی کہ ہماری کلاس میں کیسی مختلف النوع لڑکیوں کا جمگھٹا تھا اور انہی میں پولی بھی تھی جسے شاید آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ پولی اپنی ہم مذہب عیسائی لڑکیوں سے کسی قدر مختلف تھی۔ عام عیسائی لڑکیاں اپنے مذہب کا تمسخر اڑاتیں۔ ہندو لڑکیوں کی تقلید میں بندی لگاتیں۔ چولی پہنتیں اور لڑکوں کے ساتھ دوستی لگانے کو جدید فیشن تصور کرتیں لیکن ان کے برعکس پولی مذہبی قسم کی واقع ہوئی تھی۔ وہ چیپل میں سر جھکا کر دعا مانگتی اور جب سر اٹھاتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوتے۔ اس کی عقیدت مندی کے پیشِ نظر ہم نے عیسائیت کے متعلق اس کے سامنے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ سادہ قمیض شلوار میں ملبوس وہ ان تمام لڑکیوں سے پیاری معلوم ہوتی جو صبح سویرے پین کیک، غازہ اور لپ سٹک سے منہ رنگ کر قیمتی سوٹ اور رنگین ساڑھیاں پہن کر کالج آیا کرتی تھیں۔ اکثر لڑکیوں کا خیال تھا کہ کم از کم بیس لڑکے تو ضرور پولی کے پیچھے اپنی جان سے بیزار ہوں گے لیکن میں جانتی تھی کہ پولی کا چاہنے والا کوئی نہ تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ چھچھوری نہ تھی۔ وہ محبت کو ہنسی مذاق یا دل بستگی کا سامان نہ سمجھتی تھی۔

وہ اور میں لوکاٹ کے درخت کے نیچے ہری ہری دوب پر لیٹ کر بہت سی باتیں کیا کرتیں۔ وہ ہمیشہ آنکھیں موند کر غیر مرئی محبت کی ستائش کرتی اور اس جذبہ کو ازل اور ابد کے درمیان اس طرح پھیلا دیتی کہ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ قرونِ وسطیٰ کے کسی ناول کی ہیروئن ہو جس کے لیے کشت و خون ہوا کرتے۔ جس کی خاطر لوگ اپنی جان پر کھیل جاتے۔ جس کی ایک نگاہ کی قیمت ایک جان ہوا کرتی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے شوہر کی تبدیلی اچانک کراچی ہو گئی اور انہیں جلد ہی وہاں چلے جانا پڑا۔ ان کی روانگی کے بعد دس پندرہ دن کی مہلت ملی جس میں گھر کا سامان بمشکل پیک کیا جا سکا۔ سولھویں دن بمعہ اپنے تینوں بچوں کے میں بھی کراچی کی

طرف چل دی۔

شام کا دھندلکا باہر چھایا ہوا تھا۔ دن بھر کے سفر کی وجہ سے بچے تھک گئے تھے لو آرام سے اپنی نشستوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ اب کوپے میں قدرے سکون تھا۔

یوں تو بچے ایک بہت بڑی مصیبت ہیں لیکن سفر میں یہ مصیبت ایک آفت بن جاتی ہے جس کا مداوا کم از کم ایک ماں کے پاس تو نہیں ہوتا۔ سفر میں ان کی طبیعت کے ایسے ایسے جوہر کھلتے ہیں جن کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ گاڑی کے ڈبوں میں یہی ننھے ننھیاں دیوزادوں کا روپ دھار کر نتھنے پھیلائے "آدم بو! آدم بو!" کرتے پھرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی دیوزادوں سے مجھے پالا پڑا تھا اور میں آدم زاد شہزادی کی طرح انہیں دیکھ دیکھ کر کبھی ہنستی اور کبھی روتی تھی۔ اس بے بسی کے عالم میں بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہر ایک کی ٹھکائی کر دی۔ ساس مارکٹائی اور چھینا جھپٹی میں ملتان کا سٹیشن آ گیا۔ شام رات سے گلے مل رہی تھی۔ باہر اندھیرا دبے پاؤں رینگ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر ایک نظر باہر دیکھا۔ ایسی کئی شامیں ہوسٹل میں چپکے چپکے آتی تھیں اور رات کی اندھیری کھڈ میں اتر جاتی تھیں۔ ایسے لمحوں میں ساری لڑکیاں اپنے دروازوں کے کھٹکے چڑھا کر اپنے اپنے بستروں میں دبک جاتیں اور اپنی بھیگی ہوئی پلکوں کو پونچھے بغیر جالی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگتیں۔ ہر کمرے میں ساون رت آ جاتی مگر جھڑی نہ لگتی۔

آج بھی کچھ ایسی ہی شام تھی مگر یہ ہوسٹل نہ تھا ملتان کا سٹیشن تھا۔ یہ میرا محبوب کمرہ نہ تھا۔ سبز رنگ کی گاڑی کا ایک ڈبہ تھا۔ یہاں میز کرسیوں پہ میری کتابیں نہ پڑی تھیں بلکہ سیٹوں پر تین فتین منتضے بچے پڑے تھے۔ وہاں سے یہاں تک کوئی لمبا فاصلہ نہ تھا پھر بھی کس قدر دوری تھی۔ کتنا بعد، کتنی مسافت — میں نے اکتا کر شیشہ چڑھا دیا اور کھڑکی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔

کسی نے شیشہ بجایا مگر میں نے توجہ نہ دی۔

"بھئی ذرا دروازہ کھولیے!" آواز گڑگڑائی۔

"کیا مصیبت ہے۔" میں نے ویسے ہی کہا۔ "یہ کوپے ریزرو ہے۔"

لیکن شاید اسے میری آواز سنائی نہ دی اور شیشے پر اسی طرح انگلی بجتی رہی۔ میں نے منہ پھیر کر قہر آلود نگاہوں سے ادھر دیکھا۔

ہائے وہ تو پولی تھی۔ میری پولی۔ ہمارے کالج کی پولی!

اس نے میری صورت دیکھتے ہی چیخ کر کہا:

"ارجمند —"

دروازہ کھلا اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

بچے گردنیں اٹھا اٹھا کر حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ سامنے بیڑی پیتے ہوئے ایک پھل فروش نے ہمیں بغل گیر ہوتے دیکھ کر پیار بھری نظروں سے ہمیں دیکھا اور پھر جھک کر تختہ کھجانے لگا۔

اپنا پرس سیٹ پر ڈالتے ہوئے پولی بچوں کی طرف اشارہ کر کے بولی:

"یہ سب تمہارے ہیں ارجی؟"

"ہاں —" میں نے اعتراف کیا۔

"تو تم ان کی تربیت نفسیات کے اصولوں پر کر رہی ہو نا جیسے تم کہا کرتی تھیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں پولی۔" میں نے ہارمانتے ہوئے کہا۔

"شادی سے پہلے تو بچوں کی تربیت کے مجھے تین نفسیاتی طریق یاد تھے۔ اب میرے تین بچے ہیں اور ایک بھی طریق یاد نہیں۔"

اس پہ پولی ذرا سا مسکرائی اور بڑے تکلف سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”اور تمہارے بچے کہاں ہیں پولی؟“ میں نے اپنی سیٹ جھاڑ کر پوچھا۔

”میرے بچے! ـــــ میری شادی نہیں ہوئی ارجی!“ اس نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

”یعنی؟ ـــــ“

”آج تقریباً دس سال ہوئے ہیں اس بات کو ـــــ“ پولی نے اتنا کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

وہ مجھے اب بھی کالج والی پولی نظر آ رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ پہنے، کندھوں پر سفید شال ڈالے وہ بالکل چینی گڑیا معلوم ہو رہی تھی لیکن اس کے بال اب ویسے نہیں رہے تھے۔ وہ مکئی کے بھوٹوں کی طرح دھوپ سے جا چکے تھے اور اس کی جلد میں وہ نمایاں دل کشی نہیں تھی پر اس کی معصومیت میں اب بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔

”پولی شادی کر لو!“ میں نے جانے کیا سوچ کر کہا۔

”کیوں ارجی! یہ ذمہ داریاں بہت بھاتی ہیں تمہیں ـــــ؟“ اس نے تکیے پر سر رکھ کر پوچھا۔

”میں لیٹ جاؤں ارجی؟“

”ضرور ضرور۔ مجھے تعجب ہے پولی! تم نے شادی کیوں نہ کی؟“ میں نے پھر سلسلۂ کلام شروع کیا۔

”تم حسین تھیں۔ سمجھدار تھیں۔ گھریلو کاموں میں طاق تھیں ـــــ اور ـــــ“

”پھر بھی میری شادی نہ ہو سکی۔“

”کیوں ـــــ؟“

”میں جو کچھ چاہتی تھی وہ مجھے ملا نہیں۔“

”تم کیا چاہتی تھیں؟“

”خلوص ـــــ مگر شاید مجھے کچھ اور کہنا چاہیے۔ بہر حال میرے واقعات سن لو۔“

”خدا جانے آج تمہیں دیکھ کر دل میں کچھ سوا درد ہوتا ہے۔“

”ارجی! شاید تمہیں یاد ہو گا۔ کالج کی آخری ٹرم میں وہ دبلا پتلا لڑکا ارجن ـــــ وہی نا جس کی آنکھ میں نقص تھا ـــــ اچھا تھا بیچارہ۔“

”وہی نا جو ذرا اکڑ اکڑ کر چلتا تھا۔ سُرجیت کا بھائی؟ کھلاڑی تھا شاید۔“

”ہاں ہاں۔ وہی تو میری محبت کا دم بھرنے لگا تھا لیکن مجھے اس کی کوئی بات پسند نہ تھی ـــــ اور وہ آرچر۔ وہ لمبا چوڑا جوان، وہ بھی مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔“

پولی اپنی انگلی کے ایک چھلّے کے ساتھ کھیلنے لگی جس میں چھوٹے چھوٹے یاقوت ریزے جڑے تھے۔

”ارجی! تمہیں کلثوم یاد ہے؟ وہی جس کی آنکھیں بہت پیاری تھیں۔“

”کون سی کلثوم؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو فرسٹ ایئر میں آئی تھی۔ جسے سب میرا دم چھلّا کہا کرتی تھیں ـــــ وہی کلثوم جس نے پہلے ہی روز تمہارے کمرے میں بیٹھ کر پیارے پیارے گیت گائے تھے۔“

”ارے ہاں وہی کلثوم نا جس کے بال اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔“

”بالکل۔ اس کا چچا زاد بھائی دیکھا تھا تم نے؟ مقصود!“

”ہوں۔ ارے ہاں۔ ایمان سے بڑا اسمارٹ لڑکا تھا۔ وہی نا جو گورنمنٹ کالج میں پڑھا کرتا تھا اور کلثوم کے پیچھے دیوانہ تھا۔ ہر ہفتے اسے ملنے بھی آیا کرتا تھا۔“

”ہاں وہی مقصود! جانتی ہو ارجی! وہ کلثوم کو چھوڑ کر میرے پیچھے دیوانہ ہو گیا ـــــ اور اس نے اپنی دیوانگی کا ثبوت بھی دے دیا۔“

میں پولی کے قریب کھسک آئی۔

”کلثوم کی سالگرہ پر میں پہلے پہل اس سے ملی تھی۔ وہ باغیچہ میں کلثوم سے ملنے کیلیے

خدا جانے کب سے بیٹھا ہوا تھا اور وہ ہم لوگوں میں اس طرح گھری ہوئی تھی کہ اسے جان چھڑانی مشکل ہو رہی تھی — لیکن ایک موقع ایسا بھی آیا کہ وہ کمرے سے کھسک گئی اور وہ جب دس پندرہ منٹ برابر غائب رہی تو مجھے اسے ڈھونڈنے باغ کی طرف بھی جانا پڑا۔ وہ بنچ پر بڑے اطمینان سے بیٹھی مقصود کے ساتھ باتیں کر رہی تھی لیکن میری آمد پر اسے اپنی خفت مٹانے کے لیے مقصود سے میرا تعارف کرانا ہی پڑا اور ارجی! — مقصود اس بچے کی طرح مجھے گھورتا رہا جس نے گرمیوں میں پہلی بار آئس کریم دیکھی ہو — میں گھبرا گئی — اس کے بعد جب کبھی وہ کلثوم سے ملنے آتا، کلثوم مجھے اپنے ساتھ زبردستی گھسیٹ کر کسی نہ کسی بہانے لے جاتی اور مجھے اس سے ملنا ہی پڑتا — لیکن ارجی! بقول ہم لڑکیوں کے چونکہ میں نے اسے کوئی لفٹ نہ دی اس لیے وہ مجھے HIGH BROW پکارنے لگا۔"

پولی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

"مقصود بیک وقت ایک شاعر اور زمانہ پرست انسان تھا۔ وہ کھلکھلا کر قہقہہ بھی لگا سکتا تھا اور نمناک آنکھوں سے دوسرے کا درد بھی بٹا سکتا تھا۔ وہ ادیب بھی تھا اور سیاسیات کا طالب علم بھی۔ رفتہ رفتہ میں جان گئی کہ مجھے چاہنے کے باوجود وہ میرے لیے کچھ بھی نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ شدت سے چاہ بھی سکتا تھا اور عمل کی راہ میں بیگانہ بھی رہتا تھا — ارجی! — وہ عجیب لڑکا تھا لیکن کس قدر دلفریب، کیسا بھولا بھالا اور کیسا چالاک۔"

پولی ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ بیتے دنوں کی طرف لوٹ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں لیکن میں نے اسے جھنجھوڑا اور کہا:

"اب یہ راز کھول دو۔ یہ تجسس تو مجھے مار ڈالے گا پولی!"

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو گلابیاں آپ ہی چھلک گئیں۔ آنسوؤں کے باوجود ان میں عجیب بے رونقی تھی۔ وہ سپنوں کی طرح نہ تو سنولائی ہوئی تھی اور نہ ہی راکھ کی طرح

بجھی بجھی۔ پھر بھی میں نے دیکھا ان میں وہ بات نہ رہی تھی جو کالج میں ہوا کرتی تھی۔ اس نے بڑے تھکے ماندے سے انداز میں کہا:

"بی۔ اے کرنے کے بعد میں نے بی ٹی کی اور پھر سرگودھا سیکنڈ مسٹرس ہو کر چلی گئی۔ تقریباً سال بھر، نہیں، ڈیڑھ سال وہاں کام کیا۔ پھر میری تبدیلی گورداسپور ہو گئی — تم نے گورداسپور دیکھا ہے! چھوٹا سا شہر، بڑا سا قصبہ۔ گرمیوں میں وہاں بڑے دھڑلے سے بارشیں ہوا کرتیں۔ دھرم سالہ جاتی ہوئی ہوائیں وہاں ضرور رپٹ پڑتیں۔ بڑے آم جامن ہوتے تھے وہاں —"

ایک ایسے ہی دن جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں اور باقی استانیاں بیٹھی آم کھا رہی تھیں کہ مائی میرے پاس ایک چٹ لے کر آئی، لکھا تھا:

"کہاں کھو گئیں تم۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈا ہے۔ ابھی آ کر ملو. . . ."

اور میں یہ پرزہ اپنی ہمجولیوں سے چھپاتی ہوئی برآمدے میں پہنچی۔ مقصود بھیگے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ستون کا سہارا لیے یوں کھڑا تھا جیسے ڈیڈی کی بھولی بسری چھڑی کمرے کے کونے میں لگی رہتی ہے۔ اس کی عینک کے دھندلے شیشوں کے پیچھے سے دو دھبے نظر آ رہے تھے۔ شاید یہ اس کی آنکھیں تھیں۔

"ہیلو پولی —"

اس نے ہاتھ ایک دم آگے بڑھا کر آہستہ آہستہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"کہو مقصود! تم کہاں سے ٹپک پڑے ہو۔"

پھر رسمی باتیں ہونے لگیں۔

کلثوم کا ذکر آیا تو مقصود نے ہنستے ہوئے بتایا کہ کلثوم کی شادی ہو گئی ہے اور مجھے بالکل افسوس نہ ہوا اور پھر اس نے ایک دم بڑی جسارت اور لجاجت سے کہا:

"پولی: میرے ساتھ لاہور چلو دو دن کے لیے — صرف دو دن کے لیے۔"

مجھے اس کی یہ بات اس قدر بُری لگی ارجی ــــ کہ میں نے تنگ آ کر جواب دیا:

"تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے مقصود؟ کیا میں اتنی چیپ ہوں؟"

'وہ سب کچھ جس کی شاید تمہیں خبر نہیں ہے" ــــ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

'.... آخر تم نے ایسی بات کہی ہی کیوں؟"

'جی چاہا .....'

'بس مجھے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ جانتے ہو، میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ میں کوئی کھلونا ہوں؟"

اور ارجی! مجھے رونا آ گیا اور میں اسے کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ آئی۔ مجھے کوئی ہفتہ بھر اسی بات کا غصہ رہا۔ بار بار میرا جی چاہتا کہ ایک ڈانٹ بھرا خط اسے لکھوں لیکن چونکہ اس کا پتہ معلوم نہیں تھا اس لیے خاموش رہنا پڑا اور ایک دن وہ پھر اچانک ٹپک پڑا۔

'پولی! تم جانتی ہو کشمیری لوگ اپنی قوم سے باہر شادی نہیں کرتے ـ ورنہ ــ'

'لیکن میں نے کب تم سے فرمائش کی ہے کہ تم مجھ سے شادی کرو؟'

'آخر تمہارے ساتھ مل بیٹھنے کا کوئی طریق تو ہو گا۔ تم میرے ساتھ باہر نہیں جاتیں خط نہیں لکھتیں۔ کہیں ملنے کا وعدہ نہیں کرتیں۔ سینما نہیں جاتیں۔ آخر میں کیا کروں؟"

'میں کھلونا نہیں ہوں مقصود ــــ اور یہ تمہارے ساتھ پھرنا پھرانا مجھے منظور نہیں۔ اگر تم میری خاطر دنیا اور خاندان کے خلاف سینہ سپر ہونے کی سکت نہیں رکھتے تو مجھے کیوں کوستے ہو۔ آخر تمہاری خاطر میں بھی تو بوڑھے باپ سے لڑائی مول لوں گی ــ بہنا ــ !"

پتہ نہیں میں بے خیالی میں یہ سب ہی کچھ کیوں کہہ گئی۔

"پولی! ــــ پولی!!" اس نے میری باتوں کی شہ پا کر کہا۔

"یہاں برآمدے میں یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ یہاں نوکر چاکر آتے جاتے ہیں۔ یہاں سکول کی مائیاں چوروں کی طرح دیکھتی ہیں۔ یہاں شاید اب بھی کسی دروازے کے ساتھ لگی تمہاری سہیلیاں تمہاری باتیں سُن رہی ہوں گی ــــ چلو کمپنی باغ ــــ"

"مقصود! پھر وہی بات ــــ سنو! میں کسی مرد کے ساتھ باہر نہیں جاؤں گی۔ بس یہی میرا اصول ہے ــــ اور ــــ اور ــــ'

پولی خاموش ہو گئی۔ نیند کے مارے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے رسماً اس سے کہا:

'پولی! ذرا دیر کے لیے سو جاؤ"۔

'نہیں ــــ" اس نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا:

"ایسے انسان کا ذکر چھیڑا ہے تو اب نیند کہاں۔ اب تو کتھا سنا کر ہی نیند آئے گی ــــ تمہیں دیکھ کر آج سارا زہر اُگل دینے کو جی چاہتا ہے"۔

ہاں تو ارجی! اس کے بعد ہم پھر کئی روز نہ ملے۔ وہ اس دفعہ خفا گیا تھا اور میں نے اسے منانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

ایک صبح وہ سکول کے وقت ہی آ گیا۔ میں دسویں جماعت کو پڑھا رہی تھی ــــ ہیڈ مسٹریس کا رقعہ پہنچا اور میں ڈرتی ہوئی دفتر پہنچی۔

'مس اینڈریوز! آپ کے کزن آئے ہیں"۔

اور میں مسکراتی ہوئی اپنے نئے کزن سے ملنے چلی گئی۔

"کیوں آئے ہو تم؟" میں نے یونہی تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"پولی! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"۔ اس نے تپاک سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اور میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:

"مجھے پہلے یہ انگوٹھی پہنانی چاہیے تھی" اس نے شرارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پولی! یہ ہماری منگنی کی انگوٹھی ہے۔ یاد رہے"۔

"اورارجی! دیکھو۔ یہ وہی انگوٹھی ہے۔ مجھے ہمیشہ سے یاقوت دبزے پسند تھے یہ سادہ چھلا لعلوں سے جڑا ہُوا دیکھتی ہونا، یہ اسی کی نشانی ہے"۔

میں نے اس انگوٹھی کو غور سے دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا کہ اگر وہ چھلا اس کے ہاتھ سے اتار لیا جائے تو وہ ہاتھ بالکل سُونا ہو جائے گا جیسے کسی ہندو سہاگن کا فراخ ماتھا بغیر بندی کے اُجاڑ ہو جاتا ہے۔

ارجی! مجھے مقصود پر بڑا اعتماد تھا۔ میں اس کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ اس کے ساتھ لارنس گئی۔ سینما گئی۔ سارا دن انارکلی گھومتی رہی۔ مجھے وہم وگمان بھی نہ تھا کہ وہ بے وفا ہے — لیکن شاید اسے بے وفا کہنا بھی ٹھیک نہیں — وہ بے وفائی کی تعریف پر بھی پورا نہیں بیٹھتا۔

اس ہفتے کے بعد جب میں لاہور سے واپس آئی تو ڈیڈی سکول آئے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں غضب سے سُرخ ہوگئیں اور وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولے:

"پولی! تم نے منگنی کرلی اور اطلاع مجھے منگنی کے بعد دی۔ خوب!!"

"جی! —" میں نے اپنی سینڈل کو گھورتے ہوئے کہا۔

"جانتی ہو یہ ہندو مسلمان ہمارے نہیں ہو سکتے۔ ہمارے مذہب ...."

"لیکن ڈیڈی! مقصود تو ایسا نہیں"۔ میں نے دیدہ دلیری سے کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ اس قدر امیر باپ کا بیٹا کیا وفا کرے گا۔ وہ تمہارے ساتھ

کھیل رہا ہے — ابھی کچھ نہیں گیا۔ منگنی توڑ دو"۔

میں رونے لگی تو انھوں نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے یسوع مسیح سے دعا مانگنی شروع کر دی:

"اے خدا کے پاک بیٹے! میری لڑکی، گنہ گار لڑکی کو اتنی طاقت دے کہ وہ سچ جھوٹ، کفر اور ایمان میں تمیز کر سکے۔

اے پاک مریم کے پاک فرزند! اپنی اس بھیڑ کو واپس بُلا لے۔ یہ ہم سے بچھوٹتی جاتی ہے"۔

...... اور ارجی! میں نہ چاہتے ہوئے بھی ڈیڈی کے ساتھ زانو پر گر گئی — لیکن میں نے منگنی نہیں توڑی۔

ڈیڈی نے مجھے بہت سمجھایا اور بہت لمبے چوڑے لیکچر دیے۔ انھوں نے مجھ سے بار بار کہا، مقصود تجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ وہ محض تجھ سے کھیل رہا ہے اور جب کھیل سے جی بھر جائے گا تو کھلاڑی چلا جائے گا۔

مجھے ڈیڈی کی باتوں پر اعتبار تو نہ آیا لیکن ایک طرح کا کھٹکا پیدا ہو گیا اور جب دوسری بار ہم ملے تو میں نے مقصود سے ساری واردات کہہ دی۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے عجب بے بسی سے کہا:

"مقصود! شادی جلد ہی کرلیں۔ لوگ کیا سمجھیں گے۔ خود میرے ڈیڈی —"

وہ جھلا گیا۔

"آخر تم کیا سمجھتی ہو! شادی بیاہ کھیل تو نہیں کہ کانا اور لے دوڑے۔ مجھے بھی اپنے ماں باپ کو منانا ہے۔ اپنی جائیداد سے کیسے ہاتھ دھولوں؟ کم از کم تین سال —"

"میں تین سال انتظار نہیں کروں گی"۔ میں نے چیخ کر کہا۔

"تمہیں کرنا ہی ہوگا"۔

"کوئی دھونس ہے؟"

"ہاں۔ آخر تم میری منگیتر ہو اور پھر ـــ"

مجھے اس کی بات بہت بری لگی اور میں رونے لگی۔ مجھے روتے دیکھ کر اس نے گڑگڑا کر کہا:

"پولی! ـــ پولی خفا ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو تم مجھے ملتی نظر نہیں آتی ہو ـــ اور جس طریق سے ملتی دکھائی دیتی ہو وہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ یعنی میں اپنے خاندان سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اب نہ تم چھوٹتی ہو اور نہ ہی خاندان۔ بتاؤ ہے نا مشکل؟"

اور وہ آنکھیں میچ کر سوچنے لگا۔ اس کے فراخ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مجھے اس کا تذبذب اس قدر برا لگا کہ کیا کہوں؟

میں نے چھلا اتار کر اس کے قریب رکھ دیا اور بولی:

"مقصود! یہ پہلے سوچنے کی باتیں تھیں۔ اب وقت نہیں رہا خیر ـــ خیر مجھے یہ منظور نہیں کہ تم اپنا خاندان چھوڑو ـــ اگر میری خوشی منظور ہے تو پھر مجھے ملنے نہ آنا۔"

اور واقعی وہ پھر مجھے ملنے نہ آیا۔

میری تبدیلی راولپنڈی ہو گئی۔ پنجاب کے چٹیل میدانوں سے دور میں پہاڑوں کی وادیوں میں کھو گئی اور وہاں مجھے راجو ملا۔ چھ مہینے کے لیے تو مجھے خود وہم ہو گیا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ میں ہر وقت اس کے متعلق سوچتی رہتی اور اس کی باتیں یاد کیا کرتی۔

لیکن ایک دن اس نے عجیب انداز میں کہا:

"پولی! تم مجھے بے حد پیاری لگتی ہو۔ بے حد! میں بہت بزدل ہوں۔ بے حد بزدل ـــ چاہتا تمہیں ہوں اور شادی رابعہ سے کروں گا۔"

اور اسی دن میری ساری محبت ختم ہو گئی۔ مجھے وہ بھی مقصود لگنے لگا لیکن میں راجو سے نفرت کرنے لگی اور مقصود کو میں بھولنے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک دفعہ میں چھٹیوں میں گھر آ رہی تھی اور سنسان سٹیشن پر میں بنچ پر بیٹھی لاہور والی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی کہ میری نگاہ مقصود پہ پڑی۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں اڑاتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔

"کہاں کے ارادے ہیں؟" اس نے میرے پاس آ کر بڑی بے تکلفی سے کہا۔

"جہنم کے!"

"بڑی اچھی جگہ ہے۔" وہ مسکراتا ہوا میرے پاس بیٹھ گیا:

"میں بھی گرمیاں گزارنے وہیں جا رہا ہوں لیکن اتنا عرصہ کہاں رہیں؟"

"جہنم میں۔"

"میں بھی وہیں تھا لیکن تم سے تو ملاقات نہ ہو سکی۔"

اور میں اس سے زیادہ دیر خفا نہ رہ سکی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا مدتوں کا بچھڑا ہوا دیرینہ رفیق ہو جو میرا نہ ہونے کے باوجود بھی میرا تھا۔

ہم دونوں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں اکیلے بیٹھے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا:

"پولی! تمہارے بعد نہ جانے کتنی لڑکیوں سے دل لگایا لیکن سچ پوچھو تو وہ بھی تمہاری یاد تازہ کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس عرصہ میں صرف یہی خیال دامن گیر رہا کہ کہیں پولی مل جائے تو اس سے معافی مانگ لوں اور پھر اس سے منگنی کر لوں اور ـــ"

"اور پھر توڑ دوں ـــ کیوں؟"

"ہاں پولی! تم میں وہ کیا بات ہے جو اوروں میں مجھے نظر نہیں آتی۔"

"جھوٹے کہیں کے!"

میں نے بھی سوچا کہ باوجودیکہ راجو اچھا تھا اور اس کا گناہ مقصود سے کم تھا لیکن وہ مقصود نہ تھا۔

لاہور پہنچنے سے پہلے میری انگلی میں پھر وہی چھلا تھا۔ میں پھر اس کی منگیتر تھی اور اس کے ساتھ جا رہی تھی ـــ"

گاڑی ہم دونوں کو کراچی کی طرف گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ باہر سوائے ہماری کھڑکی کی روشنی کے کسی قریبی ڈبے میں روشنی نہ آ رہی تھی۔ رات کا اندھیرا دور دور پھیل چکا تھا اور سوائے گاڑی کی کھٹاکھٹ اور پولی کی دھیمی آواز کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ میرے بچے تھکے ماندے کھلاڑیوں کی طرح بے حال سو رہے تھے۔

"اُس مرتبہ ارجی! ایک عجیب و غریب واقعہ ہو گیا۔ ہم دونوں لارنس گئے۔ وہاں پہاڑی پر ایک سفید گلاب کی جھاڑی کے قریب ہم دونوں بنچ پر بیٹھے تھے۔ مقصود مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ ہائے کس قدر باتیں کی تھیں اس دن ہم نے۔ چڑیوں کے کاغذی انڈوں سے لے کر ایٹم بم تک! میں بنچ کے ساتھ سر لگائے اس کے ساتھ لگی بیٹھی تھی کہ سامنے والی پگڈنڈی پر ایک ادھیڑ عمر کا جوڑا چپکلا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے خوف اور غصے کے ملے جلے جذبات میں پکارا:

"مقصود!"

اور مقصود اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے پرائمری جماعت کا ڈرپوک بچہ استاد کی شکل دیکھ کر سہم جاتا ہے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ابّی!"

"یہ کون ہے؟"

میں بھی ششدر ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس کے جواب کی منتظر تھی ـــ

"یہ پولی ہے!"

"لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اور میں نے مقصود کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ مجھے اس کی محبت سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہی تو موقع، یہی تو وقت تھا کہ وہ میری طرف داری کرتا، لیکن اس نے بڑے تحمل سے سر جھکا کر کہا:

"کچھ نہیں ابّی!"

"جا لڑکی! اپنے گھر جا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہا۔ "کیوں اپنے ساتھ ہمیں بھی بدنام کرتی ہے۔"

ارجی! میں مقصود کی طرف نگاہ کیے بغیر اپنی راہ چل دی۔ جس طرح میں گردن جھکائے دھیرے دھیرے پگڈنڈی پر اترتی چلی جا رہی تھی اس طرح مقصود سے نفرت میرے رگ و پے میں اتر رہی تھی۔ اس نے پہلے بھی دھکا دیا تھا لیکن اس دفعہ تو جیسے اس نے مجھے تحت الثریٰ میں دھکیل دیا۔

دوسرے دن میں نے اس کی انگوٹھی بذریعہ ڈاک واپس کر دی۔

وہ تین چار بار مجھے ملنے آیا لیکن ہر بار میں نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ اس نے مجھے متعدد خط لکھے۔ معافی مانگی لیکن میں نہ پسیجی۔ میں اس سے نفرت کرنے کی مشق کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن اپنے ذہن سے کھرچ رہی تھی۔ اس نے سکول میں میرے کمرے میں کودنے کی دھمکی دی لیکن میں نے پرواہ نہ کی۔ اس نے دریا میں غرق ہونے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن میں ملتفت نہ ہوئی۔ اس نے نہ صرف میری محبت کی توہین کی تھی بلکہ مخالفت کے سامنے میرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس سے ایسی توقع نہ تھی۔

اور پھر ارجی! میں نے اسے بھولنے کے لیے، اس سے بدلہ لینے کے لیے آرچر سے منگنی کر لی۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں

اور میرا کوئی نہیں۔ ڈیڈی میرے والد ہوتے ہوئے بھی میرے نہ تھے اور تمام بوڑھوں کی طرح یسوع مسیح کے گُن گاتے رہتے تھے اور ارجی! جوانی میں غیر محسوس غیر مرئی چیزوں کی محبت کا اعتبار مشکل سے ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ مقصود کی الفت بھی کم ہوتی چلی گئی۔ اس کا سرخ و سپید رنگ یاد رہ گیا۔ اس کی سہمی ہوئی نگاہیں یاد رہ گئیں۔ اس کی الٹی سیدھی باتیں ذہن سے چمٹی رہ گئیں پَر اس کی محبت کو میں نے دل سے نکال دیا۔ میں اسے بھول گئی ارجی —— اسے بھول گئی اور ایک سہارے کی خاطر آرچر سے منگنی کر لی۔ ڈیڈی اس رشتے سے بہت خوش تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو ایک پنتھ دو کاج کہ سہارا بھی ملا اور ڈیڈی کی خوشنودی بھی اور پھر آرچر مجھے چاہتا بھی تو تھا۔ کیا ہُوا اگر میں اسے پسند نہ کرتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ آخر مقصود میں کیا دھرا تھا جو آرچر میں نہیں۔

لیکن ایک خوف میری جان کو لاگو ہو گیا اور وہ یہی تھا کہ میں کسی دن یونہی جذبات کی رَو میں بہہ کر یہ منگنی بھی نہ توڑ دوں اس لیے میں نے اپنی منگنی کی تصویر اخبار میں چھپوا دی اور شکر کا سانس لیا۔

آرچر ہوائی جہازوں کی ٹریننگ کے لیے لندن چلا تو میں بھی کراچی تک اسے چھوڑنے گئی۔ آخر کیوں نہ جاتی۔ میں نے اس سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

"لیکن ایک دن ارجی —— !" اور وہ خاموش ہو گئی۔

اور باوجودیکہ مجھ پر نیند طاری ہو چلی تھی، میں چونک پڑی:

"اور ہاں پولی ایک —— ؟"

"ایک دن مقصود خدا جانے کہاں سے آ گیا۔ صبح دس بجے مجھے چِٹ ملی۔ "للہ مجھے ملو۔" لیکن میں باہر نہ گئی۔ میں سمجھتی تھی کہ گھنٹہ پون گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد وہ خود ہی چلا جائے گا لیکن وہ اسی طرح بیٹھا رہا اور شام کو سکول میں امن چین پھیل جانے کے بعد بھی یہی خبر آئی کہ وہ صاحب بیٹھے ابھی تک میرا انتظار کر رہے ہیں۔

پھر مجھے ایک اور چِٹ ملی:

"یقین مانو قیامت تک یونہی بیٹھا انتظار کرتا رہوں گا۔"

آخر مجھے اس سے لڑائی مول لینے کے لیے ہیڈ مسٹریس کے دفتر جانا ہی پڑا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ ہیڈ مسٹریس کے اندھیرے دفتر سے پنکھے کی آواز آ رہی تھی —— میں آگے بڑھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر میز پہ جھک گیا۔ شاید وہ رو رہا تھا۔

"پولی! ——" اس نے دھیرے سے کہا۔ اور میں ہیڈ مسٹریس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کہو۔"

"آرچر سے منگنی توڑ کر یہ انگوٹھی پہن لو —— ورنہ —— ورنہ ——" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"..... ورنہ تم مجھے مار ڈالو گے۔"

پھر مجھے رونا آ گیا اور میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا:

"یا تو مجھے مار ڈالو مقصود یا اپنی ہمت کو زندہ —— زندہ ——" اور مجھ سے فقرہ مکمل نہ ہو سکا۔

"پولی! تم نہیں جانتیں یہ زندگی کتنی کٹھن ہے۔" اس نے بے بسی سے مجھے تکتے ہوئے کہا:

"زمانے کا گلوگیر ہاتھ بڑا ہی کرخت ہے۔ خاندان کی محبت بڑی دلکش ہے لیکن تم ان سے کہیں زیادہ دلفریب ہو —— جانتی ہو پولی! میں نے اپنے باپ کی موت کی دعا مانگی ہے۔ اپنے خاندان کی ——" اس نے اپنا تھکا ہوا سر پھر ہاتھوں پر رکھ لیا اور چُپ ہو گیا۔

اس کی باتوں سے خلوص عیاں تھا لیکن میں بے اعتباری کے حربوں سے مزین ہو کر

آئی تھی۔

"چلو مری چلیں"، اس نے گڑگڑا کر کہا۔

"میں یہ ذکر سننا نہیں چاہتی"۔ مجھے غصّہ آگیا۔

"پولی!"

اسے بھی غصّہ آگیا:

"ساری عمر روتے روتے ذرا مشکل ہی سے گزرے گی"۔

"پروا نہیں"۔

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"آخر تم نے اپنے آپ کو مجبور کیا رکھا ہے مقصود؟"

جانتی ہو ہم دونوں ازل سے ایک دوسرے کے تھے"

"میں ازل اور ابد کے قصّے نہیں جانتی۔ میں تو اس زندگی کو جانتی ہوں اور یہ جانتی ہوں کہ میں اس دنیا میں تمہاری نہیں ہو سکتی چاہے تم ازل کے قصے کہو یا ابد کی داستانیں"۔

"پولی"۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا:

"آخری بار کہہ رہا ہوں۔ . . . ."

"میں بھی آخری بار کہہ رہی ہوں کہ میں آرچر سے شادی کا وعدہ کر چکی ہوں"۔

اس نے بھی چھلّا جیب سے نکالا اور پھر عجیب سی بے بسی سے دیکھا اور میز پر دھر دیا اور دھیرے سے کمرے سے جاتے ہوئے کہا:

"اسے منگنی کی انگوٹھی نہ سمجھنا پولی! — یہ ایک نشانی ہے — تمہاری شادی کا پیشگی تحفہ —"

اور جانتی ہو آرچی! پھر کیا ہُوا؟ ایک بھیانک سی بات ہو گئی۔ ایک عجیب و غریب واقعہ" — پولی نے دفعتاً آنکھیں کھولیں اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا پولی؟" میں نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"مقصود نے اسی رات اپنے دماغ میں پستول داغ لی۔ اس کا آخری خط مجھے دو دن بعد ملا — لکھا تھا:

پولی!

ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے تھے لیکن، ہم دونوں ایک دوسرے کی تخریب کا باعث بنے۔ میں تمہیں الزام نہیں دیتا۔ شاید اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا — تم سے میری تمام امیدیں وابستہ تھیں اور — میں تم سے ناخوش نہیں صرف اپنے سے ناخوش جا رہا ہوں۔ میں نے دو بار تمہیں سخت پریشان کیا ہے۔ پہلی بار تو واقعی میرا ارادہ شادی کا نہ تھا لیکن دوسری بار پولی! یقین مانو میں تمہارا تھا اور صرف تمہارا تھا اور میں تمہارا ہی رہا ہوں — ازل سے — !"

پولی خاموش ہو گئی اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی:

"ٹریجڈی یہ نہیں کہ اسے محبت کا جواب محبت میں نہ ملا۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ اس نے زندگی جیسی نعمت کی قدر نہیں کی — کاش وہ زندہ رہتا — کاش اسے علم ہوتا کہ انسانی زندگی کتنی قیمتی ہے — کس قدر خوبصورت ہے اور کچھ لوگ کیسے اسے سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور جیے جاتے ہیں حالانکہ جینے کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہوتی —"

بولی کی آواز بھرا گئی ـــ

اور ـــ

وہ ڈبے سے باہر دیکھنے لگی ـــ

باہر ـــ

اندھے اندھیروں میں کھڑکیوں سے جانے والی روشنی بھاگی جا رہی تھی!

مات

نہ جانے یہ چکّر کیسے چلا؟

آنٹی کو لگتا تھا کہ آج تک جتنی خبریں اخباروں میں چھپیں اور آیندہ بھی چھپتی رہیں گی وہ سب کی سب اس خبر کے سامنے بیکار ہیں۔ نہ تو یہ خبر پولیٹیکل تھی نہ کسی ملک نے کسی اور ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر دی تھی۔ مرگِ ناگہانی، حادثہ، ڈکیتی یا اغوا کا بھی معاملہ نہ تھا۔ کھیلوں سے بھی اس خبر کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ خبر تو گھروں کے اشتہار، ٹینڈروں کے نوٹس، نوکریوں کی اطلاع اور فلموں کے سکینڈل سے بھی معمولی تھی لیکن اس خبر سے لپٹ کر آنٹی کا دل چِیتو ہو گیا۔

خبر کا تعلق دراصل جھنجھوڑنے، بھنبھوڑنے اور کسی ثابت ذہن کو اس کے نقطۂ تعلق سے ہٹانے کا ہوتا ہے۔ شائستہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ اس بُری طرح وہ ساری عمر جھنجھوڑی ہلائی اور اپنے مرکز سے ہٹائی نہیں گئی۔ معاً اسے محسوس ہوا ـــ وہ گوبھی کے پتّوں کا انبار ہے جو سبزی منڈی کے باہر پڑا گلتا رہتا ہے اور جسے بیرچشم گائے بھینسیں بھی نہیں کھاتیں۔

شائستہ بھگت آنٹی تھی۔ اس نے آج تک یہ سوچا ہی نہ تھا کہ آنٹی خالہ، آپا، پھوپھی،

ماسی، کسی بڑی عمر کی عورت کو پکارنے کا بے تکلف طریقہ ہے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ اس کے بڈھے شوہر کی رعایت سے لوگ اسے کمسنی ہی میں آنٹی پکارنے لگے تھے اور یہ روایت سی بن گئی تھی، اس کا عمر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چھوٹے بڑے رشتہ دار، دوست، سب اسے آنٹی ہی بلاتے تھے۔ لطیف صاحب کو البتہ لوگ مختلف ناموں سے پکارتے تھے۔

بھائی صاحب، چچا جی، تایا، بڑے ابا، دادا، سبھی نام ان کی مٹی خراب کرنے کو کافی تھے کیونکہ لطیف صاحب کا چہرہ وقت بریدہ مصری ممی کی طرح تھا۔ جلد ایسی نیلی مائل سبز تھی کہ شبہ ہوتا سانپ کاٹے کا علاج تو کروا چکے ہیں پر سانپ کے زہر کا اثر رگوں میں موجود ہے ویسے بھی ماتھے پر بھنوری تھی۔ ابرو گھنے اور ناک کی سیدھ ملواں تھے۔ اس بھونڈی شکل و صورت پر بات کرنے کا ڈھب کبھی نہ آیا۔ سچ بولتے تو لگتا جھوٹ بول رہے ہیں۔ جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے تو محسوس ہوتا کہ جھوٹ بھی سلیقے سے بولنے کا طور نہیں جانتے۔

لیکن شائستہ آنٹی کا چراغ اللہ کے تیل سے جلتا تھا۔ بھری جوانی میں تو وہ پلکیں اٹھانے جھکانے سے ہی بھونچال اٹھا سکتی تھی۔ اب بھی خدا اُن پر بہت مہربان تھا۔ دو جوان بیٹیوں کی ماں تو وہ کبھی لگتی ہی نہیں تھیں لطیف سے دو قدم پر وہ ان کی بیوی بھی نظر نہ آتیں۔ دل چاہتا کہ وہ گوندنی کی طرح زیور سے لدلدا کر تخت پوش پر بیٹھی رہیں اور تمام ایرے غیرے مور چھل جھلتے رہیں۔ لوگوں کا دل ہی مورتی پوجن پر آمادہ نہ رہتا تھا بلکہ خود جگت آنٹی کا خیال تھا کہ یہ تعریف، پوجا، پرستش کسی نوبہار نوخاستہ کا حق نہیں بلکہ ان کی میراث ہے۔

لیکن یہ تب کی بات ہے جب انہیں دنیا کی اہم ترین خبر نہیں ملی تھی۔

صبح جب درزی نے دو خوبصورت جوڑے لا کر دیے تو وہ بالکل نارمل محسوس کر رہی تھیں۔ اسے کسی قسم کا کُتا گھاس چرتا ہوا نہ تھا۔ دو چوڑی دار پاجاموں کے ساتھ گھیر دار حیدرآبادی قمیص اور سوا تین گز کے جھل جھل کرتے چمکتے دوپٹے تھے۔ ان جوڑوں کو دیکھتے ہی اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ کون سا وہ ڈنر پر پہنے گی اور کون سا لنچ پر؟ ان کے ساتھ زیور کا چناؤ اور خوشبو تک

کی پسند وہ دل میں کر چکی تھی۔

خبر پہنچنے سے پہلے اس نے کپڑے ٹرائی کرنے کے لیے سبزی مائل نیلا چوڑی دار پاجامہ پہنا، کھلی قمیص کو احتیاط سے تن پر ڈالا اور جگ مگ جگ مگ دوپٹہ اوڑھ کر بڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پتہ نہیں کیوں پہلی بار اس کی خوش اعتمادی کو ٹھیس لگی۔ اسے شک گزرا کہ اس کی پنڈلیاں کچھ زیادہ بھاری ہو چکی ہیں۔ کولہے پہلے کی طرح سڈول نہیں رہے اور وہ امراؤ جان ادا لگنے کی بجائے میراثن بھائی کی طرح سب طرف سے کھائی کھیلی نظر آ رہی ہے اس لمحہ اسے اپنے آپ پر، آئینے پر اور سب سے زیادہ درزی پر غصہ آیا۔ یہ کم بخت درزی بڑا ٹھرکی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کے کپڑے توجہ سے سیتا ہے اور — یہ خیال چند ثانیے رہا — پھر بوڑھے افسر کی طرح اس نے اپنے ماضی کے ریکارڈ پہ نازاں ہو کر یہ خیال دل سے نکال دیا کہ ابھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ جو عورت تیس سال سے اونچی سوسائٹی میں مس یونیورس کا رول ادا کر رہی ہو، اسے اتنی چھوٹی سی بات کیونکر ہلا سکتی تھی؟

لیکن اسی وقت کہیں سے وہ بھاری مونچھوں اور نمی نمی مسکراہٹ والا سیلز آفیسر آ دھمکا اور ساتھ ہی دنیا کی اہم ترین خبر ملی — اور وہ بھی بذریعہ تار — اس کی دونوں جواں سال بہویں شام کی فلائٹ سے امریکہ سے سیدھی پہنچ رہی ہیں۔

دو سدھائی ہوئی چار سو چالیس وولٹ کی بجلیاں!

اس نے سیلز آفیسر کو مرعوب کرنے کے لیے رات کو ڈنر دے رکھا تھا لیکن رات سے پہلے تو اس کی دونوں بہویں شاور لے کر، تازہ دم اعلیٰ لباس میں سینٹ کی بوتلوں کی طرح آراستہ پارٹی میں موجود ہوں گی — اسے معلوم تھا کہ فاران دل پھینک تھا اور اس کی بہویں گو گھر اجاڑنے کی حد تک فلرٹ نہیں تھیں لیکن نظر جھاڑنے، حرکتِ قلب بڑھانے اور زہر کھانے کے خواب جگانے تک ضرور لے جاتی تھیں۔

وہ سارے شہر کی فیشن ایبل عورتوں کی خانہ ساز تھی۔ اس کا مشورہ مفت اور بے مثال ہوتا

لیکن اب تار سامنے پڑا تھا۔ ایک سبزی مائل چوڑی دار پاجامہ اس کی ٹانگوں پہ بندوق کے غلاف کی طرح چڑھا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ رات کے ڈنر پہ اس کا بنے گا کیا؟ دو ان امریکہ پلٹ بہوؤں سے کیسے نپٹے گی؟ حملہ آور کی خبر مل گئی تھی لیکن سدباب کا کوئی نسخہ اسے کارگر ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

ایک تو اس کے دونوں بیٹے لطیف صاحب پہ گئے تھے۔ بس ان میں بھی باپ کی اکلوتی خوبی تھی۔ یہ بابا داس جس چیز کو چھو لیتے سونے کی بن جاتی لیکن کسی عورت کے دل کو پاچھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ امریکہ میں سٹور پہ سٹور کھولتے جا رہے تھے ـــــ ریڈی میڈ کپڑے، چمڑے کی جیکٹیں، بوتیک کا مال، تولیے کا ڈھیر دھڑا دھڑ امپورٹ کر رہے تھے۔ اسی رفتار سے بیچ رہے تھے اور ان کی بیویاں رضانیوں ـــــ کی طرح کبھی کبھی ان کی حضوری میں رہتی تھیں۔ ورنہ کبھی بیروت کبھی کیلیفورنیا ـــــ کبھی ہوائی ـــــ جہاں جاتیں اکٹھی دونالی بندوق کی طرح ـــــ ان کے قصے جب تک پاکستان پہنچتے وہ کسی اور شہر میں پہنچ چکی ہوتیں ـــــ جگت آنٹی کو اپنے نیم گنجے بیٹوں پر بہت غصہ آتا لیکن کیا کرتیں۔ اتنے فاصلے سے تو ممتا کا داؤ بھی نہ چلتا تھا۔ تین سال پہلے وہ شائستہ کے ساتھ رہتی تھیں لیکن تب وہ ہر پارٹی میں ان کو مات دے چکی تھیں۔ اب ان اُڑن سانپوں کی شہرت بہت سریع التاثیر ہو گئی تھی۔ ان کی بڑی بہو روزی اور چھوٹی بہو انیلا دونوں زہر ہلاہل تھیں۔ بڑی کا رنگ اگر دبتا تھا تو اس کا جسم اس قدر سڈول تھا کہ اجنتا کی غاروں میں بنے ہوئے پدمنی روپ جسم اس کے سامنے شرمسار ہو جاتے۔ بیٹھتی چلتی اٹھتی اسے دیکھو دیکھو کر جی نہ بھرتا۔ چھوٹی انیلا گول گول گیشا گرل تھی۔ گول کلائیاں، گول بازو، گول دہن ـــــ گول کولہے، گول کمر اور گول گول باتیں۔ قد اس کا دراز نہ تھا لیکن رنگت چاہی گلاب سے مشابہ تھی۔ شبہ ہوتا کہ چہرے پہ شفق کی بھی بھی سُرخی ہے لیکن دل گواہی دیتا کہ سب میک اپ کا کرشمہ ہے۔

مصیبت ان شوں شاں بہوؤں تک نہ تھی۔ بکھیڑا تو سارا فاران کا تھا! پتہ نہیں وہ کس وقت

آنٹی کے دل میں سما گیا تھا اور رہ جاتی تھا۔ نہ درزی کپڑے خراب سی کر لاتا نہ ٹرائی کے وقت وہ پہنچتا نہ اسی وقت کلو میوں کا ٹیلکس پہنچتا اور نہ ہی آنٹی کو اس شوہر کی مُتیلی کو اپنے داؤ پیچ تبدیل کرنے کا خیال آتا ـــــ نہ ہی وہ اس قدر جلد ایل بی ڈبلیو ہو جاتی۔

دیمک ایک دن میں نہیں لگتی ـــــ عمارت ہمیشہ اینٹ اینٹ گرتی ہے ـــــ اور قومیں قدم قدم برباد ہوتی ہیں۔ شاید پہلا پتھر اس روز گرا جس روز مسز سبحانی کے گھر کافی پارٹی تھی۔ کافی پارٹی، اجتنی میٹنگ اور وی سی آر پر فلم دن چڑھے کے وقت کٹی کا عام پروگرام تھا۔ اس وقت بھی پارٹی کی خواتین ان گنت اچھی خوشبوؤں میں بسی موجود عورتوں کی تعریفیں اور عدم موجود خواتین کی نکتہ چینیوں میں کھلے دل سے شریک تھیں ـــــ وی سی آر پر فلم چل رہی تھی لیکن اسے بھی سب کم نگاہی سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی اصل توجہ ایک دوسرے کے کپڑے زیور اور مسز سبحانی کے ڈرائنگ روم کے سامانِ آرائش پر تھی۔

اس روز آنٹی شائستہ حسبِ معمول لیٹ داخل ہوئی ـــــ آنٹی کو معلوم تھا کہ لیٹ پہنچنے میں کیسے وہ سب سے تر و تازہ اور نمایاں نظر آتی ہے ـــــ ہمیشہ کی طرح تہلکہ خیز، روح پرور اور تیقن بھری ـــــ آنٹی کو معلوم تھا کہ وہ کس وقت، کیسے اور کس کس پر کیسے ایفکٹ کرتی ہے

اس روز بھی یہ ایمو نیا گیس آئی اور ایک صوفے میں جا کر یوں بیٹھی جیسے رومن عہد کی ملکہ ہو۔ اس نے بصد تکلف اپنا نیم عریاں بازو تردد سے صوفہ کی پشت پہ رکھا اور انگلیاں ڈھیلی چھوڑ دیں پرانی ملاقاتیں اور اجنبی نو واردیں سب کی سب اس کی انگوٹھیوں میں گم ہو گئیں۔ بیٹھتے وقت سینے میں کساوٹ اور گریبان میں لٹکنے والے لاکٹ میں تڑپنے کی کیفیت پیدا ہو ہی گئی تھی لیکن جب اس نے گھٹنے پہ گھٹنا دھرا اور گنبد کو فوم کی گدی پر ٹکایا تو اس کے بیٹھنے میں ایک ماہر کلاکار کا رنگ شامل ہو گیا۔ اب تک شائستہ اتنی نظروں کو متاثر کر چکی تھی کہ ایک اچھے کمپیئر کی طرح اسے معلوم تھا کہ اس کی کون سی ادا کس شخص پہ، کس حد تک اثر انداز ہو رہی ہے؟

"بھئی ہمیں ان لڑکیوں سے انٹروڈیوس کراؤ مسز بھاٹی ___ " خود اعتمادی کے ساتھ بڑی لاڈ بھری آواز میں آنٹی بولی۔ لڑکیوں کا لفظ اس نے محض تکلف کے طور پر استعمال کیا تھا ورنہ اپنے سوا وہ کسی کو لڑکی ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اسے لگتا تھا کہ لڑکیاں عام طور پہ برسات دیدہ پھلجھڑیاں ہوتی ہیں۔

"یہ میری بھانجیاں ہیں۔ ہوم اینڈ سوشل سائنس والا کالج ہے نا! وہاں پڑھتی ہیں دونوں ان کو بہت شوق تھا ہماری کافی پارٹی کا ___ میں نے کہا تم بھی آجانا بھئی ___ میری سہیلیوں سے ملنا ___ "

آنٹی نے ابرو اٹھایا اور مربیانہ انداز میں مسکرائی۔

"دراصل جی۔ ہم دونوں کو ٹھیک طرح سے پتہ نہیں تھا کہ پارٹی کس دن ہے۔ یہ کہتی تھی کہ فرائی ڈے کو ہے۔ میں کہتی تھی کہ ٹیوزڈے کو ___ اسی گھپلے کی وجہ سے ہم دونوں تو کالج یونیفارم میں آگئیں"۔ سانولی لڑکی بولی۔

"اور یہاں آکر پتہ چلا کہ پارٹی پیر کے روز ہے ___ " آنٹی نے خوشی، سچائی اور شوق سے عاری قہقہہ لگایا۔ ایسے قہقہوں پر انہیں ایک مدت سے دادل رہی تھی۔

دوسری گگھی نے لحظہ بھر کو حیران ہو کر آنٹی کو دیکھا۔ پھر کہنے لگی:

ہم دونوں تو اتنی امپریس ہوتی ہیں ___ اتنی امپریس ہوئی ہیں کہ ہماری آواز ہی نہیں نکلتی ___ "

اب شائستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سفید شیفون کا آدھا آنچل اس کے بازو پر لٹکا تھا۔ وہ ڈھلے ڈھلائے جسم کو فیشن پریڈ کی طرح پیش کرتے ہوئے نمایاں آواز میں بولی:

"اچھا رٹیو! گیس کرو میری ایج کیا ہے؟"

وہ یہ گیس کئی پارٹیوں میں کئی لوگوں سے لگوا چکی تھی لیکن یا تو کوئی بھی اس کی صحیح عمر جانچ نہیں سکا تھا یا جانچ کر اس کے اظہار کے قابل نہ تھا۔ اس کی آنکھوں کے اردگرد کوّے کے پنجوں

جیسی لکیریں ضرور پڑ چکی تھیں اور دہن بھی لکیر دار ہو چکا تھا لیکن یہ دونوں تبدیلیاں میک اپ کی معمولی تہ سے چھپ جاتی تھیں۔

سامنے کھڑی یونیفارم میں ملبوس لڑکیوں نے آنٹی پر نظر ڈالی۔ پھر ایک دوسری کو ٹٹولا اور پھر اپنے بھانویں برِصغیر ایشیا و روس میں باکو تیل کا کنواں دریافت کر لیا۔ گگھی نے اپنا سستا سا کلپ درست کرتے ہوئے کہا:

"قریباً ففٹی ایئرز آنٹی ___ "

"ففٹی ___ اور ففٹی فور ___ اس کے درمیان کہیں ___ " سانولی بولی۔

جگت آنٹی پر نیوٹران بم گرا۔ اس کا جسم تو باقی رہا لیکن روح، شوخی، احساسِ زندگی سب کچھ قابلِ ذکر پرواز کر گیا ___ یہ تو آنٹی کی سوشل اسٹیکو مچولی تھی۔ وہ نئے ملاقاتیوں کو اپنی عمر کے متعلق دبی دبی خفیف اور کھلی کھلی مسکراہٹ کے ساتھ گیس ضرور کرواتی تھی لیکن آج تک کسی نے انہیں پینتیس سے زیادہ کا نہ بتایا تھا۔

آنٹی اس جواب کے بعد کھڑی ضرور تھیں لیکن اگر اس وقت ان پہ ایک تنکر خورے کا پر بھی آگرتا تو وہ منہ کے بل گرتیں۔

"کیوں آنٹی! ٹھیک ہے نا ہمارا اندازہ ___ "

"بالکل بالکل ___ اور کیا۔ اس سال میں ترپن کی ہو جاؤں گی اکتوبر میں ___ "

پتہ نہیں یہ کوئی مذاق تھا؟ ___ کسی قسم کی جیت تھی یا پھر عورتیں کسی پرانے حساب کو برابر کر رہی تھیں، بڑے زور کی تالی بجی اور اس سے بھی اونچا قہقہہ بلند ہوا۔

تاج محل کی یہ پہلی اینٹ گری۔

اس واقعہ کے عین تیسرے دن وہ اپنے بڈھے گنجے گدلی آنکھوں والے شوہر کے ساتھ شہر کے ایک معروف بزنس مین کے گھر ڈنر پر گئی۔ لطیف صاحب آنٹی سے بمشکل دو تین سال بڑے تھے لیکن پھپھوندی کھائی ڈبل روٹی کی طرح ان کا رنگ ہرا ہرا نیلا تھا۔ چہرے پہ ایک بے دلی تھی

چونکہ بزنس اتنی لمبی چوڑی اور وقت کو کھا جانے والی تھی کہ فلرٹ کرنے کا وقت بھی نہ ملتا تھا۔ اس نیچرل ٹانک سے محروم ہو کر وہ مردکم اور جہیز زیادہ نظر آتے تھے۔ ادھر آنٹی ان کے ساتھ جوانی کا سمبل تھیں۔ ان کی معیت میں اپنی روح بچاتے بچاتے بھی لطیف صاحب بہت زیادہ بے جان ہو چکے تھے۔

ڈنر پہ شہر کے معززین کا اجتماع تھا۔ دو تین ریٹائرڈ ایکٹریسیں بھی آئی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر پروڈیوسروں اور پبلک کی عقل پر رونا آتا تھا جنھوں نے ان نا آفریں صورتوں کو پردہ سکرین سے اتار کر محفلوں کی جان بنا دیا تھا۔ کچھ جدید سوسائٹی گرلز خواتین تھیں لیکن ساری محفل میں شائستہ بیگم کے جوڑ کی کوئی عورت نہ تھی۔ اس کا لباس سفید، آواز میں قدرتی لاڈ، اداؤں میں مشتق دیدہ لگاوٹ، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کے انداز میں مہارت آمیز کشش تھی۔ اس نے اس دنیا میں پورے ترپن سال گزارے تھے لیکن کسی سال کی خزاں کا اس پر بوجھ نہ پڑا تھا۔

شائستہ اپنی پلیٹ پر تھوڑا سا سلاد، روسٹ کی ہوئی مچھلی کا قتلہ اور تھوڑی وائٹ ساس ڈالے چپل ہیل پر ڈگمگ ڈولتی بوفے ڈنر کے مہمانوں سے مل رہی تھی ـــــ کبھی اس ٹکڑی میں کبھی اس گروپ میں۔ اس کی پلیٹ بھرنے کے لیے شہر کے معزز افسر ڈونگے اٹھائے پھر رہے تھے۔ اسے ٹیشو پیش کرنے کے عمل میں ملک التجار گنے کا ڈبہ نذرانہ بنائے پیچھے پیچھے گھوم رہے تھے۔ پانی اور ڈرنکس کے گلاس ملک کے نامور ڈاکٹروں کے ہاتھوں میں تھے ـــــ ادیب شاعر انوکھے واقعات کا خوانچہ لگائے اس کے منتظر تھے۔ ان مشتاق نظروں نے جیسے مل کر ایک مکڑی کا جال بنایا جس میں شائستہ بیگم بڑی شائستگی سے پھنس گئی۔

آج تک اس نے کبھی کسی ایسے شخص سے بات نہ کی تھی جس سے اس کا باضابطہ تعارف نہ ہوا ہو۔ اس معاملے میں وہ پوری انگریز تھی۔ گھنی طلائی بازوؤں والے صوفوں پر اجنبی لوگوں کے ساتھ بیٹھی رہتی لیکن کچھ ایسی سرد مہری سے کہ اگر تعارف نہ ہوتا تو رسمی سلام کی نوبت بھی نہ آتی۔ اجنبیوں کی محفل میں وہ پہروں لب سکیڑے اپنی ناک میں پڑی ہوئی ڈائمنڈ کی تیلی کو

دیکھ کر گزار سکتی تھی لیکن کبھی کبھی اپنے ہی قدموں میں غلط راستوں کے نشانات ہوتے ہیں یہاں بڑے ہال کے پہلو میں وہ بیٹھا تھا۔ اگر وہ انٹروڈیوس ہونے کا انتظار کرتی تو شاید بُری گھڑی ٹل جاتی لیکن دھوئیں بھرے کمرے سے نکل کر آوازوں کے جنگل سے باہر آ کر یک دم وہ بہت اداس ہو گئی۔ پھر کچھ باتیں کچھ واقعات ہمیشہ فضا میں ہوتے ہیں اور اچانک ٹھاہ کر کے ماتھے میں آ لگتے ہیں جیسے آدمی کرکٹ گراؤنڈ کے قریب بیٹھا ہو اور کسی لمحے کسی وقت کرکٹ کا بال منہ پر آ لگے۔

دراصل شائستہ بیگم کو اپنی ساڑھی کے بل درست کرنے تھے۔ ابھی وہ پیٹی کوٹ کے اندر انگلیاں ڈال کر سفید ساڑھی کو جمانے ہی والی تھی کہ اس کی نظر سامنے پڑی اور جھٹ بغیر تعارف کے اس کے منہ سے نکلا:

"ہیلو ـــــ!"

وہ موٹی موٹی مستطیل سی عینکیں لگائے ناک میں انگلی پھیرتا ایکونومسٹ رسالہ پڑھ رہا تھا یکدم اس کی بھی چوری پکڑی گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بے ساختگی سے بولا:

"ہیلو جی ـــــ ہیلو ـــــ!"

"بھئی سب اندر انجوائے کر رہے ہیں تم یہاں کیوں بیٹھے ہو ـــــ چلو اندر۔"

شائستہ میں ڈھلی عمر نے ایک اور خوبی پیدا کر دی تھی۔ جوانی میں جو باتیں وہ لہجہ شرما کر منوایا کرتی تھی اب ان میں دھونس، رعب اور ماں جیسا لاڈ پیدا ہو گیا تھا۔

"جی میں گیسٹ نہیں ہوں۔ میں تو ایک کام کی غرض سے آیا ہوں۔"

شائستہ نے ایک قاتلانہ نظر نوجوان پر ڈالی۔ وہ عمر میں پچیس سے زیادہ نہ تھا چہرے پہ حسن سے زیادہ ایک عجیب قسم کا غنڈہ پن تھا۔ ساتھ ساتھ ہونٹوں کے ارد گرد کچھ حیا کے باقی ماندہ نشان بھی تھے۔ شائستہ کچھ اچھی طرح سے فیصلہ نہ کر پائی کہ یہ نوجوان عاشقوں کے قبیل سے ہے کہ محبوبوں کے قبیلے سے ـــــ شاید اس میں دونوں خوبیاں جڑواں ساتھ ساتھ

تھیں۔ بہرکیف شائستہ نے اپنے اندازے کو وثوق تک پہنچانے کے لیے تھوڑی سی مہلت اور چاہی اور اسی وقفے میں وہ کرکٹر اس کے دل میں اتر گیا۔ اس نے اپنی پلیٹ اس نوجوان کو پکڑا کر کہا:

"آؤ میرے ساتھ! تم میرے گیسٹ ہو۔ آؤ۔"

یہ کہہ کر بغیر سوچے سمجھے شائستہ آگے چل پڑی اور اس کے پیچھے وہ نوجوان ایسے چلنے لگا جیسے تنگ جوتے پہن کر آیا ہو۔

"جی۔ میں تو مرزا جی سے کچھ کاغذات اٹیسٹ کروانے آیا ہوں۔"

"ارے وہ بھی ہو جائیں گے — چلو آؤ —"

کبھی کبھی بہت کمزور غیر اہم فیصلوں میں آئندہ کے بہت اہم فیصلے چھپے ہوتے ہیں۔ گویا کوئی بادشاہ کسی سانولی اجنبی آنکھوں والی کنیز کو ایک مرتبہ مسکرا کر اپنے قریب بلانے کا کیا مرتکب ہوتا ہے کہ اسی چھوٹے سے واقعے میں سے چلتا چلاتا کہیں اس کا تخت و تاج بھی چھن جاتا ہے اور اس کے اپنے بیٹے جو دست بستہ اس کے حضور کھڑے رہتے تھے بادشاہ سلامت کو جلاوطن کر کے پھر اس کی راجدھانی کو بھی جوئے میں ہار دیتے ہیں۔

پہلی معمولی ہار میں آخری خوفناک شکست سر کے بال کھولے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی ہوتی ہے — وقت آنے پر اٹھتی ہے اور قیامت برپا کر دیتی ہے۔

وہ دونوں بڑے ہال نما ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے جہاں کٹ گلاس کے بڑے بڑے شمعدان دیواروں میں لگے ہوئے آئینوں میں اپنا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"مرزا جی — میں تو اس ینگ مین کو ساتھ لے آئی ہوں۔ فار گاڈ سیک اسے کچھ کھلائیں اتنے لعنتی نہ بنیں —"

شائستہ نے ایک بڑی پلیٹ میں خود ہی کانٹا اور روسٹ رکھ کر اسے پیش کر دیا۔ جونہی آنٹی اس کی پیٹرن بن گئی سارے مجمعے کو اس کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہ رہا۔ وہ دونوں کھانا ڈال کر

دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ بڑی دیر کے بعد آنٹی کو زندگی میں مزہ آنے لگا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مرزا صاحب کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع دیا" — اس نے بغیر کسی شکر گزاری یا حلم کے کہا — "میں تو دراصل ایک سفارش کے لیے آیا تھا۔"

"نوکری کیا ہے؟ میری سفارش کافی نہ رہے گی —"

"اگر مرزا صاحب کچھ حرف ٹیلی فون پر کہہ دیں تو کام بن سکتا ہے۔ ایک فرٹیلائزر فیکٹری میں کام ہے سیلز آفیسر کا۔"

"اب اس فکر کو نکال دو — اور شاباش میرے لیے جا کر گاجر کا حلوہ ڈال کر لاؤ۔"

"ضرور آنٹی ضرور۔"

آج تک لڑکے لڑکیاں اسے آنٹی ضرور کہتے تھے لیکن اس آنٹی لفظ کے کوئی معنی نہ تھے۔ پہلی ملاقات میں اس قدر گھل کر کبھی کسی نے اسے آنٹی نہ پکارا تھا — جیسے وہ یکدم کسی ریلوے کے باتھ روم میں اپنے چہرے کے بجائے کسی بڑھیا کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی — اور پھر سیلز آفیسر کو دیکھتی چلی گئی۔

وہ اپنے ایک ہاتھ سے کالر ٹھیک کرتا، دوسری ہتھیلی پر آنٹی کی پلیٹ جمانے میں مشغول، لوگوں میں جگہ بناتا میٹھے پکوانوں کی طرف بڑھ گیا — اونچی سوسائٹی کے مرد دولت کمانے میں اس حد تک کام آ چکے تھے کہ اب ان میں خوبصورت کپڑوں کے علاوہ ایسی کوئی بات نہ رہی تھی جس پر مرد کا لیبل لگایا جا سکتا — اس ساری مردجاتی میں یہ سیلز آفیسر بذاتِ خود ایک ٹرافی تھا اور آنٹی کی نظریں اس پر جمی تھیں۔

جس وقت نوجوان پلیٹ میں جیلی فروٹ کریم اور حلوہ لے کر لوٹا آنٹی ابھی تک کڑاہی سے اترے سٹیک کی طرح تڑتڑ کر رہی تھی۔ اس نے پلیٹ پکڑ کر اپنے پرانے آزمودہ چتون بنائے اور پوچھا:

"اچھا آنٹی تو تم نے مجھے بنا لیا۔ اب بتاؤ اس ساری محفل میں تمہارا اگلا کون ہے؟"

نوجوان اپنی خالی پلیٹ دوبارہ بھرنے کے لیے جانا چاہتا تھا۔اس کے انداز میں جلدی تھی اس نے سارے لوگوں پر نظر پھرا کر اس کے گنجے، گدلی آنکھوں والے بڈھے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا:

"جی وہ گئے ہیں نیلی بش شرٹ والے جو ٹانگ ہلا رہے ہیں مسلسل۔"

"تم انہیں جانتے ہو ——"

وہ بے دھیان کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے پلیٹ میں کونسی نمش کھانا ڈالنا چاہیے کہ پاکستانی ——؟

"نہیں جی ——" اس نے ایک خوبصورت لڑکی پر ٹکٹکی جما کر کہا۔

"ضرور تمہیں معلوم ہوگا کہ میں ان کی بیوی ہوں —— لطیف صاحب کی ——"

"جی نہیں —— میں نے پہلی بار آپ دونوں کی زیارت کی ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا —— یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بھلا تم نے یہ گیس لگایا کیسے —— میں تو اُن کی بیوی لگتی ہی نہیں ——"

"میرا خیال ہے جی ایسے شادی شدہ جوڑے جو پچیس سال ایک ساتھ گزار چکے ہوں ان کی شکلیں، طریقے، ٹیسٹ —— سب کچھ ملنے لگتا ہے۔"

شائستہ ایکسکیوزمی کہہ کر صوفے میں جا دھنسی —— پتہ نہیں کیوں، زندگی پھر کڑوی کسیلی ہو چکی تھی۔

آج تک کسی نے اسے اپنے شوہر کی بیوی نہ سمجھا تھا۔ جب تک کوئی تعارف نہ کراتا پتہ ہی نہ لگتا تھا کہ وہ اس جیلی فش کی ملکیت ہے۔ بہت سی برف ڈلوا کر شائستہ نے غٹا غٹ پانی کا پورا گلاس پیا لیکن غصہ اس کے سر کی طرف چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ٹھنڈے ہاتھ پاؤں گرم ہو گئے تھے اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر اس کی شکل کو غیر انسانی بنانے میں مصروف تھیں۔

وہ تو اس سیلز آفیسر کے کبھی ماتھے نہ لگتی لیکن دوسری صبح جب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے

سامنے بیٹھی چہرے پر آئل آف اولے کی مالش کر رہی تھی کہ اس کے مونچھوں والے بیرے نے اطلاع دی کہ ایک صاحب ملنے آئے ہیں۔

"کیا نام ہے ——؟"

"جناب یہ کارڈ ——" بیرے نے کمر میں خم ڈال کر چاندی کی ٹرے آگے بڑھا دی۔

چھوٹے سے کارڈ پر ترچھے حروف میں فاران سعید لکھا تھا اور نیچے سیدھے ٹائپ میں ایم اے برکلے کی ڈگری درج تھی۔ پہلے تو شائستہ کا دل چاہا کہ انکار کر دے لیکن پھر پہلے قدم میں ہی آخری قدم کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کیا بے چارے کو نوکری نہیں ملی۔ ذرا سی نازک مزاجی سے اُس کا کام بگڑ جائے گا۔

وہ ارادہ یہی لے کر گئی تھی کہ گھنٹی سادھے بیٹھی رہے گی اور ایسی سرد مہری سے پیش آئے گی کہ فاران کو اس راج درشن کا دوبارہ حوصلہ ہی نہ ہو گا لیکن جس وقت وہ اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اسے لگا فاران سعید رات سے گھٹ کر آدھا رہ گیا ہے۔ ماتا اور محبت اکٹھی عود کر آئیں۔

"اوہ جی سلام علیکم۔ معاف کیجیے میں نے صبح صبح آپ کو زحمت دی۔ دراصل نوکری کا تو اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن میں آپ سے اس قدر اس قدر امپریس ہوا رات کہ ساری رات سوچتا ہی رہا —— آپ ڈنر سے اتنی جلدی کیوں لوٹ آئیں؟ —— بھلا؟"

اس نے آخری سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح آؤ ناں۔" شائستہ نے دل میں سوچا۔ راج رانی کے پاس کوئی گورے لٹھے کی طرح اکڑا اکڑا تھوڑی جاتا ہے۔

"کیسے آئے ؟"

"بس جی آنا پڑا ——"

یہ سوال شائستہ نے ملاقات کے تیسرے گھنٹے تک کوئی دس مرتبہ پوچھا لیکن ان تین گھنٹوں میں ایک بار بھی فاران نے نوکری کی بات نہ کی۔ بالآخر ہار کر اسی نے یہ ٹاپک کھولا اور وعدہ کیا کہ وہ

اس کی سفارش کرے گی۔ فاران اُن مردوں میں تھا جو بن کہے اپنی منواتے ہیں۔

پہلے وہ نوکری کی سفارش کے سلسلے میں آتا رہا۔ پھر نوکری کا شکریہ ادا کرنے کبھی بالوشاہی کبھی لڈوؤں کے ڈبے لانے لگا۔ ہر بار مٹھائی اس کے ضرور ساتھ ہوتی اور وہ نوکری کا ہی شکریہ ادا کرتا رہتا۔

پہلے پہل تو شائستہ کو لگا کہ فاران اس کے دبدبے میں آگیا ہے لیکن آہستہ آہستہ اسے محسوس ہونے لگا کہ فاران اس رنواس کا مالک ہو گیا ہے۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہ وہ عاشقوں کی قبیل سے ہے لیکن اب رفتہ رفتہ اسے احساس ہو چلا تھا کہ یہ کہنہ مشق محبوب قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ فاران کو جنسِ مخالف میں بڑی دلچسپی تھی لیکن اپنا لوہا منوانے تک — وہ اسی حد تک توجہ دیتا تھا جب تک سامنے والا ہار نہ مان جائے۔

ابھی ہفتہ بھر پہلے آنٹی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ فاران کو لطیف صاحب کی موجودگی میں اپنے دونوں بیٹوں کی تصویریں دکھا رہی تھی۔ بار بار فاران کے ہاتھوں کو چھونے کا یہ چھوٹا سا داؤ تھا۔

"یہ میرا بڑا بیٹا احمد ہے اور یہ ہے چھوٹا علی — دونوں امریکہ میں ہیں۔ بڑا کاروبار پھیلا لیا ہے — اور یہ ان کی بیویاں ہیں روزی اور انیلا —"

روزی اور انیلا کی تصویریں فاران کے ہاتھ میں تھیں۔ لطیف صاحب صوفے میں بیٹھے کھلی آنکھوں سو رہے تھے اور تصویروں نے فاران کی آنکھوں میں نئی امیدیں جگا دی تھیں۔

اس نے ایک آنکھ میچ کر آنٹی کی طرف دیکھا — اور پھر آہستہ سے بولا:

"پتہ نہیں۔ میں ان دونوں میں سے کس کے لیے گر دوں گا — دونوں اچھی ہیں۔"

بات معمولی تھی۔ شائستہ کے سوشل سرکل میں فلرٹ کرنے سے نیچرل ٹانک کا کام لیا جاتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں وہ اندر سے ڈانواں ڈول ہو گئی — واقعی دونوں اچھی ہیں اور لوگوں کو گرانے کا فن جانتی تھیں۔

پھر آج صبح جب ٹیلکس ملی کہ اس کی بہوئیں روزی اور انیلا شام کو پہنچ رہی ہیں تو وہ شام کے

کپڑے ٹرائی کر رہی تھی۔ اسی وقت فاران آگیا۔ رات کا ڈنر اس نے دل ہی دل میں فاران کو اپنے قدموں میں گرانے کے لیے کیا تھا پر اب وہ دونوں چٹکیوں میں اڑانے والی آ رہی تھیں — اس کا موڈ آف تھا جب وہ چوڑی دار پاجامے، حیدرآبادی قمیص اور تین گز لمبے دوپٹے میں فاران سے ملی۔

"اتنا بڑا ڈنر ہے اور شام کو روزی اور انیلا بھی آ رہی ہیں — تین تو منسٹر آ رہے ہیں — میں انہیں کیسے ریسیو کرنے جاؤں گی ایئرپورٹ؟"

"آپ فکر نہ کریں — میں چلا جاؤں گا — اگر میں ان کو لے کر غائب ہو گیا تو —"

"تم کہاں جاؤ گے — چھوڑو — اتنی اٹریکٹو نہیں ہیں —"

"آپ نے تیاری کر لی ڈنر کی —؟"

"ہاں۔ لباس تو منتخب کر لیا ہے لیکن زیور ابھی طے نہیں ہوا — دیکھو میرا خیال ہے کہ میں اپنی ساس کی جیولری آج پہنوں گی —"

شام کو جب وہ حیدرآبادی لباس پہنے اپنی ساس کا زیور پلنگ پر پھیلائے سوچنے میں مشغول تھی کہ اسے دنیا کی ایک اور بدترین خبر ملی — فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ نیچے بیرا ریسیو کر لے گا لیکن آخر وہ زیوروں کو چھوڑ کر فون کے پاس پہنچی۔

"السلام علیکم! —"

"وعلیکم السلام فاران — بھئی کہاں ہو۔ آدھے گھنٹے میں پہنچو — بہت سے کام ہیں۔"

فاران تھوڑا سا کھانسا۔ پھر بولا۔ "میں تو ایئرپورٹ پر ہوں آنٹی — آپ نے کہا تھا ناں کہ آپ روزی اور انیلا کو ریسیو کرنے نہیں آ سکتیں۔ فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی ہے۔ بہرکیف ڈنر سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں —"

آنٹی کو یقین ہو گیا کہ واقعی اب فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں سے جانے کس زمانے کا سیلاب بند توڑ کر نکلا۔ وہ اپنی ساس کے زیوروں کو آہستہ آہستہ ڈبوں میں بند کرنے لگی۔

پھر اس کی نظر مروارید کی ایک تسبیح اور چند الائچی دانوں پر پڑی — اس نے تسبیح پلنگ پر پڑی

رہنے دی۔ حیدر آبادی لباس اتارا اور آپا کے لیے فون کیا:

'دیکھو زینب! یہ دونوں جوڑے نیچے جاکر روزی اور انیلا بی بی کے کمرے میں رکھ دو۔۔۔ ان کا میرا ناپ ایک ہی ہے۔ جب وہ ایئرپورٹ سے آئیں تو انہیں بتا دینا کہ میں نے خاص اس ڈنر کے لیے بنوائے ہیں ــــ یہ لباس پہن کر وہ تیار ہو جائیں ــ باقی فاران ان کو سمجھا دیں گے۔'

جس وقت کمالِ احتیاط سے زینب جوڑے اٹھائے رخصت ہونے لگی تو شائستہ نے اسے پھر آواز دی:

'سنو زینب! لطیف صاحب کو بتا دینا روزی اور انیلا ہوسٹ ہوں گی۔ میں ڈنر پر نہیں آؤں گی۔ ان کو بتا دینا یہ میرے وظیفے کا وقت ہے ــــ'

زینب نے آج تک بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں تسبیح نہیں دیکھی تھی۔

'اور اگر جی صاحب نے حکم دیا بلانے کا ــــ'

'دروازہ بند کر دو ــــ کوئی اللہ کی درگاہ سے بھی بلایا جا سکتا ہے۔ روزی بی بی اور انیلا بی بی کو بتا دینا کہ میں انہیں صبح ملوں گی ــــ مجھے ملنے کا حکم نہیں ہے۔'

دروازہ اندر سے مقفل کر کے وہ جائے نماز پر بیٹھ گئی ــــ

زندگی کے ترپن سال اس نے خزاں کے احساس کے بغیر کاٹے تھے۔ جب سے فاران اس کی زندگی میں آیا تھا اسے خزاں کا احساس ہونے لگا تھا ــــ یکدم مروارید کی تسبیح پر اس کے آنسو گرے تو اسے عجیب قسم کی راحت محسوس ہونے لگی۔ اسے لگا کہ اس میدان میں اس کی بوٹیں اسے مات نہ دے سکیں گی ــــ اس کھیل کی ابھی وہ بھیدی نہ ہوئی تھیں ــــ آہستہ آہستہ بغیر کچھ پڑھے تسبیح کے دانے گر رہے تھے۔ منہ ہل رہا تھا ــــ وہ جانتی تھی کہ روزی اور انیلا ابھی یہاں تک نہ آسکیں گی۔

آنسو اس کی تسبیح پر گرتے جا رہے تھے اور نیچے مہمانوں کی آمد کا شور شروع ہو گیا تھا!

حسنِ خاتمہ

اسے پکاڈلی تک ہی تو جانا تھا۔

لیکن ہیمر سمتھ سے پکاڈلی تک کا راستہ اسے زندگی سے بھی لمبا لگ رہا تھا۔ آج وہ ٹھیک بتیس سال اور بتیس دن کی ہو گئی تھی اور یہ کچھ ایسی لمبی عمر بھی نہیں لیکن فائزہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کئی صدیوں سے زندہ ہے اور جیتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس کے تو سل بھی تیار ہو چکے ہیں لیکن زندگی ختم ہونے میں نہیں آتی۔

ہیمر سمتھ بھی عجیب نام تھا۔ لوہار کا ہتھوڑا۔ اگر پاکستان میں کسی جگہ کا نام لوہار کا ہتھوڑا ہوتا تو اس نام پر کتنی شرم آتی۔ پھر اس سٹیشن سے آگے شیپرڈ بش تھا' چرواہے کی جھاڑی! یہ نام اردو میں بدلتے ہی کتنے چیپ' اجڈ اور ان کلچرڈ لگنے لگتے۔ سب سے پہلے لندن میں مستقل طور پر منتقل ہونے پر اسے اپنے لباس اور زبان پر ہی تو اعتراض ہوا تھا۔ یہ کیا' دو ٹانگوں والی 'سُتھن' چاکوں والی قمیض' اوپر سے دوپٹے کا بھی دمچھلا۔ آدمی کتنا غیر مہذب لگتا ہے ایسے لباس میں ــــ اوپر سے سلام علیکم سلام علیکم....!

انگریزی میں جو نہی گڈ مارننگ کہیں دل بشاش سا ہو جاتا ہے' مسکراہٹ چہرے پر آجاتی ہے۔ فائزہ سوچنے لگی اچھا ہی کیا عرب والوں نے کہ اب ٹیلی وژن پر سلام علیکم کی

بجائے مصباح الخیر کہتے ہیں۔ سلام علیکم کہتے تو کہتے اولڈ فیشنڈ لگتے۔

فائزہ ہیرسمتھ کے سب وے میں داخل ہوئی اور جینز کی جیب میں سے دس دس پینی کے چار سکے نکال کر اس نے سلاٹ مشین میں ڈالے۔ مشین کے پیٹ میں سے زرد رنگ کی چالیس پینی کی ٹکٹ برآمد ہو گئی۔ وہ سب وے کے کھلے سٹیشن پر پکاڈلی جانے والی ٹرین کے انتظار میں ایک بنچ پر بیٹھ کر تلی ہوئی مونگ پھلی کھانے لگی۔ یہ مونگ پھلی کا پیکٹ وہ اپنے ابا جی کی دکان سے لائی تھی۔

گلاب تندوری سٹورز ارلز کورٹ پر واقع تھی اور فائزہ اس میں پچھلے دس سال سے مشین کی طرح کام کر رہی تھی۔ اس دکان کے تین سیکشن تھے۔ ایک طرف کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ جن میں طرح طرح کے بسکٹ، جیم، دودھ کے ڈبے، مکھن، ڈبل روٹی، پیتا بریڈ اور ایسی ہی ان گنت چیزیں تھیں۔ اسی سیکشن میں ایسے کھلے کیلوی نیٹر بھی تھے جن میں ٹھنڈی مرغیاں اور برف آلود سبزیاں تھیں۔ اس سیکشن کی دوسری جانب تازہ سبزیوں اور پھلوں کے ریک تھے۔ ان کے پیچھے سارا دن اس کا بھائی الیکٹرک آری کے ساتھ حلال گوشت کاٹتا رہتا تھا۔ اسی کاٹ پیٹ میں ایک روز اس کے بائیں انگوٹھے کو بھی ضرب آ گئی تھی اور وہ اس انگوٹھے کو قریبی ڈاکٹر سے پٹی بندھوا کر پھر گوشت کاٹنے آ کھڑا ہوا تھا۔

اس علاقے میں چونکہ عرب لوگ زیادہ رہتے تھے اس لیے سارا دن عرب خواتین اور مرد اس کی دکان سے حلال گوشت پکا پکایا ٹیک ہوم کھانا، ہندوستانی اچار، پاکستانی چاول اور پھل خریدنے آتے رہتے تھے۔ ان دونوں سیکشنوں کے علاوہ دکان کے پچھلے حصے میں

شراب بکتی تھی اور دکان کے اس گپت سیکشن میں اس کا باپ بیٹھتا تھا۔ جس روز باپ کسی وجہ سے نہ آ سکتا تو فائزہ اس حصے میں بیٹھتی اور اس کی چھوٹی بہن کاؤنٹر پہ بیٹھ کر حساب کتاب کرتی۔ ورنہ عام دنوں میں گلے کی پاسبانی اور کیلکولیٹر پہ حساب کرنا، پینی کو پینی سے جوڑ کر پاؤنڈ بنانا اور پونڈوں کی گڈیاں جوڑ جوڑ کر خوش ہونا اس نے بہت جلد سیکھ لیا تھا۔

وہ پچھلے بارہ سال سے اس دکان کی دیکھ بھال میں شامل تھی۔ پاکستان میں اس نے ایف اے کیا تھا اور لندن آ کر وہ پڑھائی کرنا چاہتی تھی لیکن لندن میں صرف اولیول کرنے کے بعد اسے باپ کی دکان نے لپیٹ لیا۔ اس دکان کو وہ پاکستان میں بزنس کہتے تھے۔

پہلے جب ابا گلاب دین نے محنت مزدوری کر کے اور اماں نے ٹورسٹ بسوں میں کنڈکٹر لگ کر پیسے جمع کیے تو ان کے تینوں بچے اس جدوجہد میں شامل نہ تھے۔ پھر ابا نے ارلز کورٹ میں بڑے ٹھکانے کی جگہ سستے داموں ایک ایسے پاکستانی سے خریدی جو پاکستان واپس جا رہا تھا۔ اب اماں اور ابا مل کر دکان چلانے لگے۔ اماں رات کے وقت فائزہ اور حمیرا کی مدد سے بھنا ہوا گوشت، کابلی چنے، آلو مٹر، سموسے وغیرہ بناتی۔ پھر انہیں سلور ڈبوں میں بند کرتی۔ اوپر سٹیپ کے ساتھ قیمت لکھی جاتی۔ پھر سارا دن اماں دکان پہ گاہکوں سے نبڑتی رہتی اور باپ مال ڈھوتا لیکن جلد ہی کام بڑھنے لگا اور باپ نے ایک رات فیصلہ کیا کہ پاکستان سے زیادہ محبت کرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ سامنے والی دکان میں بہت سا ہندوستانی سامان بکتا تھا اور اس کی بکری خوب خوب ہوتی تھی۔ ابا نے بھی ہندوستانی اچار بڑیاں پاپڑ رکھنے شروع کر دیے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی دکان بھی چل نکلی۔

عربوں کے لیے حلال گوشت تو رکھا ہی جاتا تھا لیکن ابا نے محسوس کیا کہ اس گوشت کو کاٹنے اور پیکٹ بنانے کا لیبر بہت مہنگا ہے اس لیے اس نے زبیر کو کالج سے اٹھا لیا اور اس سیکشن کا مالک بنا دیا لیکن ابھی تک فائزہ کاؤنٹر پہ بیٹھنے نہیں آئی تھی۔ وہ اور حمیرا گھر پہ رہ کر دکان کے لیے کھانے دانے تیار کرتی تھیں۔

لیکن جلد ہی ابا نے محسوس کیا کہ عربوں کے علاوہ انگریز اور امریکن اور مقامی اطالوی لیبر بھی اس کی دکان پر آتے ہیں اور حلال گوشت کے علاوہ سور کا گوشت بھی بک سکتا ہے۔ کچھ دیر ابا گلاب دین ہچکچاتا رہا پھر اس نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ آخر ہم کوئی یہ گوشت کھا تھوڑی رہے ہیں۔ صرف بیچنے میں کیا حرج ہے اور پھر ہم جس ملک میں آ بیٹھے ہیں وہاں تو

توہر جگہ یہ مال بکتا ہے اور ہر چیز میں اس کی چربی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے ابا ایسے بسکٹ کیک، پنیر، چاکلیٹ وغیرہ بھی نہ لاتا تھا جن میں سؤر کی چربی پڑی ہوتی — وہ سودا لانے سے پہلے کئی کئی گھنٹے اس بات کی تفتیش میں صرف کرتا کہ جو بسکٹ کیک وہ خرید رہا ہے وہ صرف مکھن میں تیار ہوتے ہیں یا نہیں — لیکن جب ابا کو بے چارے سفید فام گاہکوں پر بہت ترس آنے لگا کہ وہ اس کی کم نظری اور دقیانوسی خیالات کی وجہ سے مایوس لوٹتے ہیں تو حلال گوشت کے علاوہ اور قسم کے گوشت بھی دکان پر بکنے لگے۔ ساتھ ساتھ دوسری اشیاء خریدتے وقت بھی ابا نے یہ پڑھنا چھوڑ دیا کہ کن کن اشیاء کے مرکّب سے یہ سامان بنا ہے۔ اب گلاب دین سٹورز پر ایسے بسکٹ، کیک، پنیر ملنے لگے جن میں سؤر کی چربی کا امتزاج ہوتا۔ ابا گلاب دین کا خیال تھا کہ سؤر کا گوشت کھانا منع ہے اسے بیچنا منع نہیں ہے۔

جب گلاب سٹورز بہت مالدار ہونے لگا تو ابا کو خیال پیدا ہوا کہ دکان کے دو سکشنوں کے علاوہ تیسرا سکشن بھی ضروری ہے۔ اس سکشن میں اس کا ارادہ شراب وغیرہ رکھنے کا تھا۔ کچھ عرصہ تو اس نے اپنے بچوں اور بیوی سے یہ ارادہ چھپائے رکھا لیکن جب پچھلے سکشن میں لکڑی کے ریک اور کاؤنٹر بن گئے۔ شرابوں کے کریٹ آگئے اور سجائے گئے تو ابا گلاب دین نے محض اطلاعاً اپنے اپارٹمنٹ میں کہا کہ اب گلّے پر بیٹھنے والا کوئی نہیں اس لیے فائزہ روز دکان پر بیٹھا کرے گی اور اماں اور چھوٹی حمیرا ٹیک اوے کھانا تیار اور پیک کریں گی۔

پتہ نہیں ابا گلاب دین اماں سے ڈر رہا تھا یا شاید اس کا خیال تھا کہ ایک گندمی رنگ کی بال کٹی جینز پہننے والی لڑکی بیرونی کاؤنٹر بہتر سنبھال سکتی ہے — فائزہ کو پہلے پہل تھوڑا دھکا لگا لیکن وہ جانتی تھی کہ ہر نئی تبدیلی اوّل اوّل دوسروں کو اور خود اپنے آپ کو چونکا دیتی ہے۔ اچھے ذہین لوگ وہ ہوتے ہیں جو نئے ماحول سے جلد ہی مطابقت پیدا کر لیں۔

اسی طرح جب اس نے شلوار قمیض چھوڑ کر اس لیے پتلون بلاؤز پہنی تھی کہ اتنی سردی میں دیسی لباس کام نہیں آتا۔ تب کچھ دن تک وہ گڑبڑاتی رہی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ جینز کی ایسی عادی ہوئی کہ اب شلوار قمیض پہنتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ ایسے ہی وہ تمام تبدیلیاں جو شروع میں حیران کرنے والی بدظن اور بدگمان رکھنے والی تھیں، اب معمول بن گئی تھیں لیکن گلاب سٹورز میں شراب بھی بکے گی اس کے لیے کافی دنوں تک بدحواسی، بے چینی اور منتشر کرنے کا موجب رہی۔

فائزہ کے لیے ایک مشکل تھی۔ وہ اپنی ماں کی بجائے اپنی دادی کی گود میں پلی تھی اور دادی نے اسے پرانی قدریں، اپنا چودہ سو سال پرانا مذہب اور بڑی پرانی تہذیب حوالے کی تھی۔ لندن آنے سے پہلے جب دادی نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تو فائزہ کو بہت دکھ ہوا۔

"کیوں دادی کیوں — ؟"

"اب میری آخری عمر ہے میں چاہتی ہوں میرا انجام نیک ہو — حسنِ خاتمہ کی خواہش ہے میری —"

"کیا مطلب — آپ وہاں ہم سب کے ساتھ ہوں گی۔ وہاں انجام نیک کیوں نہ ہوگا؟"

"لباس، زبان، مذہب — موسم — کوئی ایک بات فرق ہو تو بتاؤں۔ وہاں تو سب کچھ ہی بدلا ہوگا — میں اپنی کس کس چیز کو بچاؤں گی؟"

"آپ کا خیال ہے لندن میں نیک لوگ نہیں بستے — ان کے انجام نیک نہیں ہوتے . . . . ؟"

"لے لے لے۔ الٹی کھوپڑی ہے تیری فائزہ — میں نے یہ سب کب کہا ہے؟ میں تو کہتی ہوں وہ جگہ فرق ہے — اگر میں تیرے ساتھ گئی تو

بڑی مصیبت پڑے گی"۔

"وہ کیسے؟ ـــــ" فائزہ نے چڑ کر کہا۔

"میں جو وہاں گئی اور وہاں کی مخلوق مجھے مختلف نظر آئی تو دو ہی صورتیں ہیں یا تو میں اپنے آپ کو سچا سمجھنے کے لیے ان پر نکتہ چینی کروں گی"۔

"تو کر لینا نکتہ چینی ـ سبھی کرتے ہیں سفید آدمی پر نکتہ چینی اور پھر بھی اس کی تقلید کرتے ہیں"۔

"ناں ناں ناں ناں ـــــ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہے ـــــ کون جانے ربّ کی نظر میں کون اچھا ہے کون بُرا ـــــ"

"پھر جب آپ اتنی لبرل ہیں وادی تو چلیں ناں ـــــ"

"یہ کیا لفظ بولا تُو نے ـــــ"

"لبرل ـــ فراخ دل ـ"

"ہاں بھئی جو میں فراخدل ہو گئی تو دوسری صورت پیدا ہو گی کہ میں ان کی ماننے لگوں گی ـــــ مروّت کے ساتھ ـــــ رعب میں آ کر ـــــ اور پھر کون جانے کس وقت میں اپنے نیک انجام سے بچھڑ جاؤں ـــــ"

"تو آپ کا خیال ہے وہ لوگ غلط رہتے ہیں غلط سوچتے ہیں ـــــ"

"ہائے لڑکی یہ میں نے کب کہا ـــــ جو یہاں ہے ٹھیک ہے ـــــ صرف کوّا ہنس کی چال چلے تو اس کا حسنِ خاتمہ نہیں ہوتا"۔

ہیمر سمتھ کے سب وے پر بیٹھی فائزہ سوچ رہی تھی کوّوں کے متعلق، ہنسوں کی چال کے متعلق ـــــ اور بار بار نائیجل اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کی ہونگ ہونگ چلی کا پیکٹ ختم ہونے کو آ رہا تھا لیکن پکاڈلی جانے والی ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔

نائیجل کی آنکھیں اتنی ہلکی نیلی تھیں کہ کبھی کبھی بالکل زرد سی نظر آتیں۔ اس کے ہونٹ،

رخسار، ہاتھ سب پلاسٹک کی طرح گلابی تھے۔ وہ مہذب لوگوں کی طرح بہت آہستہ بولتا تھا اور بہت تیز چلتا تھا۔

سب سے پہلے فائزہ کی ملاقات نائیجل سے اس دن ہوئی جب وہ شراب خریدنے کے لیے گلاب سٹورز میں پہلی مرتبہ آیا۔ اس دن ابا گلاب دین کسی کام کی وجہ سے باہر گیا ہوا تھا۔ اور حمیرا بیرونی کاؤنٹر پر تولنے، حساب کتاب کرنے اور مسکرانے میں مشغول تھی۔

نائیجل نے ڈھائی پونڈ کی بوتل اور چند کے ڈبّے خریدے پھر بہت آہستہ سے بولا: "کیا آپ قیمت یہاں وصول کریں گی؟"

"نہیں۔ باہر میری بہن کاؤنٹر پر ہے"۔

سر کے اشارے سے نائیجل نے بائی بائی کہا اور چلنے لگا۔ پھر پتہ نہیں اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ رک کر بولا:

"تم ایک خوبصورت ایشیائی لڑکی ہو ـــــ ایسی ہسپانوی رنگت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے"۔

اکتیس سال کی عمر میں اگر کوئی ایسی بے ساختہ بات کہہ دے تو دل میں اچانک خوشیوں کی پنیری اگ جاتی ہے اور ایسی زندگی جو بارہ سال سے روٹین کی نذر ہو، یکدم نئے پھوٹتے ہوئے چشمے کی طرح اُبلنے لگتی ہے۔

ایسے ہی نائیجل دوسرے چوتھے شراب لینے آتا رہا۔ اب ان دونوں میں مسکراہٹوں کا لین دین عام ہو گیا تھا۔ پھر بھی دونوں یکدم اس بات سے بہت آگاہ ہو گئے تھے کہ وہ قطعی طور پر مختلف ہیں۔ جو فرق اب تک انہیں محسوس نہ ہوتے تھے اب کھل کر سامنے آ گئے تھے اور وہ دونوں پہلی مرتبہ کلچرل شاک سے خوفزدہ تھے۔ اسی ری باؤنڈ کی شکل میں وہ ایکدن الجھ گئے۔

وطن میں تھی تو رشتہ داری دوست داری میں حتی الوسع دل رکھنے کی خاطر جھوٹ بول بول کر

وہ اچھی خاصی منافق ہو چکی تھی لیکن یہاں چونکہ رشتوں کا پاس نہ تھا اس لیے وہ بڑی سچی اور کھری ہو چکی تھی اور اس بات کا بھی اسے علم نہ تھا کہ یہ تبدیلی اس میں کب اور کیسے آئی ؟

ہوا یوں کہ نائیجل جس وقت دکان میں داخل ہوا وہ اخبار پڑھ رہی تھی ۔ نائیجل نے اسے بلانے کی کوشش نہ کی اور وہ بھی اخبار کا ایک پیج دیکھنے لگا ۔ پھر پتہ نہیں وہ دونوں کتنی دیر تک پڑھتے رہے کہ اچانک حمیرا شراب والے سکشن میں داخل ہوئی ۔

"آپا ـــــ میں ذرا ہیمر سمتھ جا رہی ہوں خالہ جمیلہ کے پاس ـــــ آپ بارہ آجائیں ـــــ "

"اچھا ـــــ "

دیر تک نائیجل اچھا اچھا کرتا رہا اور مسکراتا رہا ۔ پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا کہ اس نے اخبار الٹ کر فائزہ کے سامنے رکھا ۔ اس صفحے پر ہیروئن سمگل کرنے کے جرم میں ایک پاکستانی کی تصویر چھپی تھی اور ساتھ کس طرح اور کیسے وہ پکڑا گیا تھا ، اس کی تمام تفصیلات درج تھیں ۔

"یہ تم لوگ ہیروئن کیوں سمگل کرتے ہو ؟"

شراب کی دکان میں شراب بیچتے ہوئے وہ یکدم حیران رہ گئی ۔

"اور تم لوگ جو صدیوں سے تھرڈ ورلڈ کو شراب بیچتے رہے ہو ـــــ اپنی شراب کو خوبصورت رنگوں سے سجا کر ، ان کی تصویریں چھاپ کر اتنی اشتہار بازی کرتے ہو وہ کچھ نہیں "۔

پہلی مرتبہ نائیجل کی آنکھیں گہری نیلی ہو گئیں ۔

"شراب تباہ کن نہیں ہے ۔ ہیروئن تو مار دیتی ہے ختم کر دیتی ہے "۔

"اور وہ لوگ جو سب وے سٹیشنوں پر شراب کے نشے میں اوندھے پڑے ہوتے ہیں وہ ـــــ وہ ختم نہیں ہوتے "۔

نائیجل کے پاس سائنسی تاویلیں تھیں ۔ فائزہ کے پاس ایمانی انسانی تاویلیں تھیں ۔

دونوں ٹھیک تھے ـــــ دونوں بے حد غلط بھی تھے ـــــ پہلے الزامی گفتگو ہوئی ، پھر جھگڑا ہوا اور اس کے بعد یکدم محبت کا جذبہ بیدار ہو گیا ۔

کبھی کبھی شدید ٹکراؤ کھٹے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ اپنی بقا کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اب نائیجل اور فائزہ کو ایک دوسرے سے وابستگی اپنی اپنی بقا کی شکل میں نظر آئی اور وہ دونوں گلاب سٹورز سے باہر نکل کر بھی ملنے لگے ۔

پھر ملاقات سے وہی نتیجہ نکلا کہ انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ یک جان اور یک قالب بن جائیں لیکن جب جذبے سے پرے دنیاوی طور پر معاملات طے ہونے لگے تو سب سے بڑا مسئلہ مذہب کا نکل آیا ۔ نائیجل اپنا دیس ، زبان ، لباس ، سب کچھ بدلنے کو تیار تھا ، صرف وہ اپنا مذہب بدلنا نہیں چاہتا تھا ۔ یہ مذہب سوائے رسمیں منانے کے اس کے کام بھی نہ آتا تھا ۔ وہ چرچ ، کرائسٹ اور بائبل سب کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا ـــــ پھر بھی اتنی بڑی تبدیلی کے لیے اس کی روح رضامند نہ تھی ۔

دو روز پہلے جب وہ جمیلہ خالہ کے پاس ، ہیمر سمتھ آئی تھی تو نائیجل اسے ملنے آیا تھا ۔ شام تھی اور وہ دونوں خالہ کے اپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے ۔ فائزہ کا خیال تھا کہ نائیجل کبھی بھی اسے ملنے ہیمر سمتھ نہیں آئے گا کیونکہ آج تک وہ کبھی ان کے گھر نہیں گیا تھا لیکن شام کو اچانک نائیجل کو خالہ کے اپارٹمنٹ میں دیکھ کر فائزہ کا دل گرم سویٹر کے اندر پھیلنے لگا ۔ گھر پر کوئی نہ تھا ۔ خالہ ، خالو ، ان کی دونوں بیٹیاں ، سب کاموں پر تھے ـــــ وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر نیچے چلنے والی خوبصورت بتیوں کو دیکھنے لگی ۔ سڑک کنارے بنے ہوئے چرچ کا چھوٹا سا باغیچہ گلاب کے پھولوں سے بھرا پڑا تھا ۔

وہ دونوں چپ تھے !

لباس ، زبان ، مذہب ، کلچر ، موسم ۔ اتنے سارے فاصلوں کی چپ ان کے ہونٹوں پر تھی ۔

بڑی دیر کے بعد نائیجل نے کہا:

"میں تمہارے والد سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"کیوں۔ کس لیے؟"

"شاید اُن میں تم سے زیادہ عقل ہو ـــــ" مسکرا کر نائیجل نے کہا۔

فائزہ کے سامنے اپنا باپ آگیا جو پاکستان سے اس لیے بھاگا تھا کہ وہاں غریبی تھی اور یہاں اس لیے پھنس گیا تھا کہ یہاں امیری تھی۔

"فیصلہ تو بالآخر میرا ہوگا نائیجل"

"تم تو کہا کرتی ہو کہ تمہارے ملک میں شادیاں ماں باپ کی مرضی سے طے ہوتی ہیں"۔

"لیکن یہ ہمارا ملک نہیں ہے ناں نائیجل" فائزہ بولی۔

"تمہارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے ـــــ"

"ہاں ہے"۔

"پھر تم وہ تمام حقوق انجوائے کرتی ہو جو یہاں کے کسی نیشنل کے ہیں"۔

"لیکن میں وہ تمام فرائض ادا نہیں کر سکتی جو یہاں کے مقامی ادا کرتے ہیں"۔

وہ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر نائیجل نے اٹھتے ہوئے کہا:

"سنو فائزہ! میں مذہب تبدیل نہیں کر سکتا کیونکہ ـــــ اس لیے نہیں کہ میں ـــــ عیسائی مذہب میں یقین رکھتا ہوں بلکہ صرف اس لیے کہ میں اسلام کو جانتا ہی نہیں"۔

"آہستہ آہستہ جاننے لگو گے ـــــ"

"ہو سکتا ہے آہستہ آہستہ جاننے کے پروسیس میں میں اسلام کو قبول کرنے سے ہی انکار کر دوں۔ ـــــ میں مذہبی آدمی ہی نہیں ہوں فائزہ ـــــ میری ماں نے مجھے پرورش نہیں کیا۔ وہ کام کرتی تھی ـــــ اور ہمیشہ اتنی تھکی ہوئی لوٹتی تھی کہ اس کا چہرہ دیکھ کر اس سے کوئی بھی بات نہیں کی جا سکتی تھی ـــــ ہم دونوں فقط ـــــ کبھی کبھی ایک دوسرے

محبت کی نگاہ سے دیکھ لیتے تھے۔ اس نے مجھے تجربے سے سیکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا ـــــ میں نے سب کچھ بڑے مہنگے داموں سیکھا ہے ـــــ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں مذہب کے متعلق کچھ نہیں سیکھ سکوں گا ـــــ مذہب تو کسی گود سے سیکھا جاتا ہے۔ میں تو گود ہی میں پلا ہی نہیں ـــــ"

فائزہ چاہتی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر نائیجل کو اپنی بانہوں میں لے لے لیکن اس وقت وہ مضبوط رہنا چاہتی تھی۔

"لیکن ـــــ پھر تو ـــــ شادی نہیں ہو سکے گی نائیجل ـــــ"

"ہم سول میرج کر سکتے ہیں فائزہ ـــــ"

جب عورت بتیس سال بتیس دن کی ہو چکی ہو اور اس کی زندگی میں ایک عرصے سے گیت، چاندنی اور باغ بے معنی ہو گئے ہوں تو اچانک نیلی آنکھوں کا اس نہتی پہ وہی اثر ہوتا ہے جو فائزہ پر ہوا۔

وہ سول میرج پر رضامند ہو گئی۔

اسے پکاڈلی تک ہی تو جانا تھا۔

پکاڈلی سب وے سے تھوڑی ہی دور نائیجل کتابوں کی دکان میں کام کرتا تھا سو وہاں پہنچ کر فائزہ کو بڑی ہمت کے ساتھ آخری بار نائیجل کو خدا حافظ کہنا تھا۔

پتہ نہیں کیوں ساری رات وہ بے قرار رہی تھی۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اگر وہ نائیجل سے شادی کرے گی تو اس کا حسنِ خاتمہ نہیں ہوگا ـــــ اسے یہ خوف نہیں تھا کہ وہ اور نائیجل تھوڑی دیر کے بعد بڑی بڑی لڑائیاں لڑنے لگیں گے اور چھوٹی چھوٹی بات پر لمبے لمبے مباحثے ہوں گے بلکہ وہ جانتی تھی کہ جس طرح وہ دادی کی ساری تعلیم بھول گئی تھی اسی طرح ہر روز دن چڑھتے ہی نائیجل سے اور زیادہ پیار کرے گی۔ ہر روز پہلے دن سے زیادہ اس کے رنگ میں رنگی جائے گی۔ اسے اپنا نام، مذہب، ملک، سب کچھ بھول جائے گا اور

وہ اپنے آپ کو نائیجل سمجھنے اور بنانے میں اتنی دور نکل جائے گی کہ حسنِ خاتمہ کا تصور بھی اس کے ساتھ نہ رہے گا۔

آخر بتیس سال تیس دن کی عورت کے پاس اپنی روٹین سے نکلنے کا یہی تو ایک موقع تھا۔

دُور کھلے سب وے سے ٹرین کی آواز آ رہی تھی۔

مونگ پھلی کا پیکٹ ختم ہو چکا تھا۔

اسے پکا ڈلی تک ہی تو جانا تھا — آخری بار نائیجل سے ملنے کے لیے

بغیر وجہ بتائے شادی سے انکار کرنے کے لیے۔

ٹرین رکی۔ اس نے اپنے بیگ کو مضبوطی سے تھاما اور اندر داخل ہوئی۔ پھر ایک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے فائزہ نے سوچا:

"میرے مولیٰ — یہ بھی کیسی آزمائش بھری زندگی ہے۔ لوگ تو کہتے، میں کہ مغرب میں زندگی آسان ہوتی ہے — پھر یہ کیسا مغرب ہے اور یہ کیسی زندگی ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ میں صدیاں جی چکی ہوں۔ میرا فوسل بن چکا ہے لیکن زندگی ختم ہونے میں نہیں آتی — میرے آقا — یہ سب کیا ہے — وہاں غریبی کے دکھ تھے۔ یہاں امیری نے گلہ وبار کھا ہے — وہاں رسوم کی قید سے زندگی دم گھٹت تھی۔ یہاں آزادی ہر جگہ بہائے لیے جاتی ہے جیسے کاغذ کا پرزہ شدید آندھیوں میں آوارہ ہو — یہ سب کیا ہے یہاں اور وہاں — کیا ہے میرے خدا — حسنِ خاتمہ کب ہو۔ کہاں ہو۔ کیسے ہو!"

توبہ شکن

بی بی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ آنسو بے روک ٹوک گالوں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔

"مجھے کوئی خوشی راس نہیں آتی۔ میرا نصیب ہی ایسا ہے۔ جو خوشی ملتی ہے ایسے ملتی ہے گویا کوکا کولا کی بوتل میں ریت ملا دی ہو کسی نے۔"

آنکھیں سرخ ساٹن کی طرح چمک رہی تھیں اور سانسوں میں دمے کے اکھڑے پن کی سی کیفیت تھی۔ پاس ہی ہپو بیٹھا کھانس رہا تھا۔ کالی کھانسی نامراد کا ہلّا جب بھی ہوتا بیچارے کا منہ کھانس کھانس کر بینگن سا ہو جاتا۔ منہ سے رال بہنے لگتا اور ہاتھ پاؤں اینٹھ سے جاتے۔ امی سامنے چپ چاپ کھڑکی میں بیٹھی ان دنوں کو یاد کر رہی تھیں جب وہ ایک ڈی سی کی بیوی تھیں اور ضلع کے تمام افسروں کی بیویاں ان کی خوشامد کیا کرتی تھیں۔ وہ بڑی بڑی تقریبوں میں مہمانِ خصوصی ہوا کرتیں، اور لوگ ان سے درخت لگواتے، ربن کٹواتے۔ انعامات تقسیم کرواتے۔

پروفیسر صاحب ہر تیسرے منٹ مدھم سی آواز میں پوچھتے — "لیکن — آخر بات کیا ہے بی بی — ہوا کیا ہے —"

وہ پروفیسر صاحب کو کیا بتاتی کہ دوسروں کے اصول اپنانے سے اپنے اصول بدل

نہیں جاتے صرف ان پر غلاف بدل جاتا ہے۔ ستار کا غلاف، مشین کا غلاف، تکیے کا غلاف ——— درخت کو ہمیشہ جڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسے کرسمس ٹری کی طرح یونہی داب داب کر مٹی میں کھڑا کر دیں گے تو کے دن کھڑا رہے گا۔ بالآخر تو گرے ہی گا۔

وہ اپنے پروفیسر میاں کو کیا بتاتی کہ اس گھر سے رشتہ تڑوا کر جب وہ بانو بازار پہنچی تھی اور جس وقت وہ ربڑ کی ہوائی چپلوں کا بھاؤ چار آنے کم کروا رہی تھی تو کیا ہوا تھا؟

اس کے بوائی پھٹے پاؤں ٹوٹی چپلی میں تھے۔ ہاتھوں کے ناخنوں میں برتن مانجھ مانجھ کر کیچ جمی ہوئی تھی۔ سانس میں پیاز کے باسی لچھوں کی بو تھی۔ قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوئے اور دوپٹے کی لیس ادھڑی ہوئی تھی۔ اس ماندے حال جب وہ بانو بازار کے ناکے پر کھڑی تھی تو کیا ہوا تھا؟

یوں تو دن چڑھتے ہی روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا پر آج کا دن بھی خوب رہا۔ اِدھر پچھلی بات بھولتی تھی اُدھر نیا تھپڑ لگتا تھا۔ اِدھر تھپڑ کی ٹیس کم ہوتی تھی۔ اُدھر کوئی چٹکی کاٹ لیتا تھا۔ جو کچھ بانو بازار میں ہوا وہ تو فقط فل سٹاپ کے طور پر تھا۔

صبح سویرے ہی سنتو جمعدارنی نے برآمدے میں گھستے ہی کام کرنے سے انکار کر دیا۔ رانڈ سے اتنا ہی تو کہا تھا کہ نالیاں صاف نہیں ہوتیں۔ ذرا دھیان سے کام کیا کر۔ بس جھاڑو وہیں پٹخ کر بولی:

"میرا حساب کر دیں جی ———"

کتنی خدمتیں کی تھیں بدبخت کی۔ صبح سویرے تام چینی کے مگ میں ایک رس کے ساتھ چائے۔ رات کے جھوٹے چاول اور باسی سالن روز کا بندھا ہوا تھا۔ چھ مہینے کی نوکری میں تین نائلون جالی کے دوپٹے۔ امی کے پرانے سلیپر اور پروفیسر صاحب کی قمیص لے گئی

تھی۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ اسے جمعدارنی کہہ کر بلا لیتا۔ سب کا سنتو سنتو کہتے منہ سوکھتا تھا۔ پر وہ تو طوطے کی سگی پھوپھی تھی ——— ایسی سفید چشم واقع ہوئی کہ فوراً حساب کرا جھاڑو بغل میں داب، سر پر سلفچی دھر ——— یہ جا وہ جا۔

بی بی کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر میں آ کر پاؤں پکڑے گی۔ معافی مانگے گی اور ساری عمر کی غلامی کا عہد کرے گی۔ بھلا ایسا گھر اسے کہاں ملے گا۔ پر وہ تو ایسی دفان ہوئی کہ دوپہر کا کھانا پک کر تیار ہو گیا پر سنتو مہارانی نہ لوٹی۔

سارے گھر کی صفائیوں کے علاوہ غسلخانے بھی دھونے پڑے اور کمروں میں ٹاکی بھی پھیرنی پڑی۔ ابھی کمر سیدھی کرنے کو لیٹی ہی تھی کہ ایک مہمان بی بی آ گئیں۔ منے کی آنکھ مشکل سے لگی تھی۔ مہمان بی بی حسنِ اتفاق سے ذرا اونچا بولتی تھیں۔ منا اٹھ بیٹھا اور اٹھتے ہی کھانسنے لگا۔ کالی کھانسی کا بھی ہر علاج کر دیکھا تھا پر نہ تو ہومیوپیتھی سے آرام آیا نہ ڈاکٹری علاج سے۔ حکیموں کے کشتے اور معجون بھی رائیگاں گئے۔ بس ایک علاج رہ گیا تھا اور یہ علاج سنتو جمعدارنی بتایا کرتی تھی۔ بی بی! کسی کالے گھوڑے والے سے پوچھو کہ منے کو کیا کھلائیں۔ جو کہے سو کھلاؤ۔ دنوں میں آرام آ جائے گا۔

لیکن بات تو مہمان بی بی کی ہو رہی تھی۔ ان کے آنے سے سارے گھر والے اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے اور گرمیوں کی دوپہر میں خورشید کو ایک عدد بوتل لینے کے لیے بھگا دیا گیا۔ ساتھ ہی اتنا سارا سودا اور بھی یاد آ گیا کہ پورے پانچ روپے دینے پڑے۔

خورشید پورے تین سال سے اس گھر میں ملازم تھی۔ جب آئی تھی تو بغیر دوپٹے کے کھوکھے تک چلی جاتی تھی اور اب وہ بالوں میں پلاسٹک کے کلپ لگانے لگی تھی۔ چوری چوری پیروں کو کیوٹیکس اور منہ کو پاؤڈر لگانے کے بعد اپنے چہرے پر بے بی پاؤڈر استعمال کرنے لگی تھی۔ جب خورشید موٹی ململ کا دوپٹہ اوڑھ کر ہاتھ میں خالی سکوائش کی بوتل لے کر سراج کے کھوکھے پر پہنچی تو سڑکیں بے آباد سی ہو رہی تھیں۔ پانچ روپے کا نوٹ جو اس کے ہاتھ میں

بتی سی بن گیا تھا، نقدی والے ٹین کی ٹرے میں دھرتی ہوئی خورشید بولی:

"ایک بوتل مٹی کا تیل دو — دو سات سو سات کے صابن — تین پان سادہ — چار میٹھے — ایک نلکی سفید دھاگے کی — دو لولی پاپ اور ایک بوتل ٹھنڈی ٹھار سیون اپ کی —"

روڑی کوٹنے والا انجن بھی جا چکا تھا اور کولتار کے دو تین خالی ڈرم تازہ کوٹی ہوئی سڑک پر اوندھے پڑے تھے۔ سڑک پر سے حدت کی وجہ سے بھاپ سی اٹھتی نظر آتی تھی۔

واٹی کی لڑکی خورشید کو دیکھ کر سراج کو اپنا گاؤں دھیان یاد آ گیا۔ دھیان میں اسی وضع قطع، اسی چال کی سیندوری سے رنگ کی نوبالغ لڑکی حکیم صاحب کی ہوا کرتی تھی۔ ٹانسے کا برقعہ پہنتی تھی۔ انگریزی صابن سے منہ دھوتی تھی اور شاید خمیرہ گاؤزبان اور کشتہ مروارید بمعہ شربت صندل کے اتنی مقدار میں پی چکی تھی کہ جہاں سے گزر جاتی سیب کے مربے کی خوشبو آنے لگتی۔ گاؤں میں کسی کے گھر کوئی بیمار پڑ جاتا تو سراج اس خیال سے اس کی بیمار پرسی کرنے ضرور جاتا کہ شاید وہ اسے حکیم صاحب کے پاس دوا لینے کے لیے بھیج دے۔ جب کبھی ماں کے پیٹ میں درد اٹھتا تو سراج کو بہت خوشی ہوتی۔ حکیم صاحب ہمیشہ اس نفخ کی مریضہ کے لیے دو پڑیاں دیا کرتے تھے۔ ایک خاکی پڑیا گلاب کے عرق کے ساتھ پینا ہوتی تھی اور دوسری سفید پڑیا سونف کے عرق کے ساتھ — حکیم صاحب کی بیٹی عموماً اسے اپنے خط پوسٹ کرنے کو دیا کرتی۔ وہ ان خطوں کو لال ڈبے میں ڈالنے سے پہلے کتنی کتنی دیر سونگھتا رہتا تھا۔ ان لفافوں سے بھی سیب کے مربے کی خوشبو آیا کرتی تھی۔

اس وقت واٹی کرمو کی بیٹی گرم دوپہر میں اس کے سامنے کھڑی تھی اور سارے میں سیب کا مربہ پھیلا ہوا تھا۔

پانچ روپے کا نوٹ نقدی والے ٹرے میں سے اٹھا کر سراج نے چپچپی نظروں سے

خورشید کی طرف دیکھا اور کھنکار کر بولا — "ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ گئی۔ آہستہ آہستہ کہو نا۔ کیا کیا خریدنا ہے؟"

"ایک بوتل مٹی کا تیل — دو سات سو سات صابن — تین پان سادہ، چار میٹھے۔ ایک نلکی بٹر فلائی والی سفید رنگ کی — ایک بوتل سیون اپ کی — جلدی کر، گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

سب سے پہلے تو سراج نے کھٹاک سے سبز بوتل کا ڈھکنا کھولا اور بوتل کو خورشید کی جانب بڑھا کر بولا:

"یہ تو ہو گئی بوتل اور —"

"بوتل کیوں کھولی تُو نے — اب بی بی جی ناراض ہوں گی —"

"میں تو سمجھا کہ کھول کر دینی ہے —"

"میں نے کوئی کہا تھا تجھے کھولنے کے لیے۔"

"اچھا اچھا بابا۔ میری غلطی تھی۔ یہ بوتل تُو پی لے میں ڈھکنے والی اور دے دیتا ہوں تجھے —"

جس وقت خورشید بوتل پی رہی تھی، اس وقت بی بی کا چھوٹا بھائی اظہر ادھر سے گزرا۔ اسے سڑا سے بوتل پیتے دیکھ کر وہ مین بازار جانے کے بجائے الٹا چودھری کالونی کی طرف لوٹ گیا اور این ٹائپ کے کوارٹر میں پہنچ کر برآمدے ہی سے بولا:

"بی بی! آپ یہاں بوتل کا انتظار کر رہی ہیں اور وہ لاڈلی وہاں کھوکھے پر خود بوتل پی رہی ہے سڑا لگا کر —"

بھائی تو اخبار والے کے فرائض سرانجام دے کر سائیکل پر چلا گیا لیکن جب دو روپے تیرہ آنے کی ریزگاری مٹھی میں دبائے، دوسرے ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل اور بغل میں سات سو سات صابن کے ساتھ سیون اپ کی بوتل لیے خورشید آئی تو سنتو جمعدارنی کے

حصے کا غصہ بھی خورشید پر ہی اترا۔

"اتنی دیر لگ جاتی ہے تجھے کھوکھے پر۔"

"بڑی بھیڑ تھی جی —"

"سراج کے کھوکھے پر — اس وقت؟"

"بہت لوگوں کے مہمان آئے ہوئے ہیں جی — سمن آباد میں ویسے ہی مہمان بہت آتے ہیں — سب نوکر، تو ہمیں لے جا رہے تھے۔"

"جھوٹ نہ بول کمبخت! میں سب جانتی ہوں۔"

خورشید کا رنگ فق ہوگیا۔

"کیا جانتی ہیں جی آپ؟ —"

"ابھی کھوکھے پر کھڑی تُو — بوتل نہیں پی رہی تھی؟"

خورشید کی جان میں جان آئی۔ پھر وہ بپھر کر بولی:

"وہ میرے اپنے پیسوں کی تھی جی — آپ حساب کردیں جی میرا — مجھ سے ایسی نوکری نہیں ہوتی —"

بی بی تو حیران رہ گئی۔

سنتو کا جانا گویا خورشید کے جانے کی تمہید تھی۔ لمحوں میں بات یوں بڑھی کہ مہمان بی بی سمیت سب برآمدے میں جمع ہوگئے اور کترن بھر لڑکی نے وہ زبان درازی کی کہ جن مہمان بی بی پہ بوتل پلا کر رعب گانٹھنا تھا وہ الٹا اس گھر کو دیکھ کر قائل ہوگئیں کہ بدنظمی، بے ترتیبی اور بدتمیزی میں یہ گھر حرفِ آخر ہے۔

آناً فاناً مکان نوکرانی کے بغیر سُونا سُونا ہوگیا۔

ادھر جمعدارنی اور خورشید کا رنج تو تھا ہی، اوپر سے پپو کی کھانسی دم نہ لینے دیتی تھی۔ جب تک خورشید کا دم تھا کم از کم اسے اٹھانے پچکارنے والا تو کوئی موجود تھا۔ اب

کنگیر تو اچھوڑ چھاڑ کے بچے کو اٹھانا پڑتا۔ اسے بھی کالی کھانسی کا دورہ پڑتا تو رنگت بینگن کی سی ہو جاتی۔ آنکھیں سرخا سرخ نکل آتیں اور سانس یوں چلتا جیسے کٹی ہوئی پانی کی ٹیوب سے پانی رِس رِس کے نکلتا ہے۔

سارا دن وہ یہی سوچتی رہی کہ آخر اس نے کونسا گناہ کیا ہے جس کی پاداش میں اس کی زندگی اتنی کٹھن ہے۔ اس کے ساتھ کالج میں پڑھنے والیاں تو ایسی تھیں گویا ریشم پہ چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں اور یہاں وہ کپڑے دھونے والے تھاپے کی طرح کرخت ہو چکی تھی۔ رات کو پلنگ پر لیٹتی تو جسم سے انگارے جھڑنے لگتے۔ بدبخت خورشید کے دل میں ترس آجاتا تو دو چار منٹ دُکھتی کمر میں ٹکیاں مار دیتی ورنہ اونی آنی کرتے نیند آجاتی اور صبح پھر وہی سفید پوش غریبوں کی سی زندگی اور تندور میں لگی ہوئی روٹیوں کا سا سینک!

اُس روز دن میں کئی مرتبہ بی بی نے دل میں کہا:

"ہم سے اچھا گھر انہیں ملے گا تو دیکھیں گے۔ ابھی کل برآمدے میں آئی بیٹھی ہوں گی دونوں کالے منہ والیاں"

پر اسی دل میں اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس سے اچھا گھر ملے یا نہ ملے وہ دونوں اب لوٹ کر نہ آئیں گی۔

سارے گھر میں نظر دوڑاتی تو چھت کے جالوں سے لے کر رُکی ہوئی نالی تک اور ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں سے لے کر اندر ٹپ ٹپ برسنے والی نلکے تک عجیب کسمپرسی کا عالم تھا۔ ہر جگہ ایک آنچ کی کسر تھی۔ تین کمروں کا مکان جس کے دروازوں کے آگے ڈھیلی ڈوروں میں دھاری دار پردے پڑے تھے، عجیب سی زندگی کا سراغ دیتا تھا۔ نہ تو یہ دولت تھی اور نہ ہی یہ غریبی تھی۔ ردی کے اخبار کی طرح اس کا تشخص ختم ہو چکا تھا۔

جب تک اباجی زندہ تھے اور بات تھی۔ کبھی کبھار مائیکہ جا کر کھلی ہوا کا احساس

پیدا ہو جاتا۔ اب تو اباجی کی وفات کے بعد امی، اظہر اور منی بھی اس کے پاس آ گئے تھے امی زیادہ وقت پچھلی پوزیشن کو یاد کر کے رونے میں بسر کرتیں۔ جب رونے سے فراغت ہوتی تو وہ اڑوس پڑوس میں یہ بتانے کے لیے نکل جاتیں کہ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی بیگم تھیں اور حالات نے انہیں یہاں سمن آباد میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

منی کو مٹی کھانے کا عارضہ تھا۔ دیواریں کھرچ کھرچ کر کھوکھلی کر دی تھیں۔ نامراد سیمنٹ کا پکا فرش اپنی نرم نرم انگلیوں سے کرید کر دھر دیتی۔ بہت مرچیں کھلائیں۔ کونین ملی مٹی سے ضیافت کی۔ ہونٹوں پہ دہکتا ہوا کوئلہ رکھنے کی دھمکی دی پر وہ شیر کی بچی مٹی کو دیکھ کر بری طرح ریگشہ خلمی ہوتی۔

اظہر جس کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا جب اس کالج کے پرنسپل نے تھرڈ ڈویژن کے باعث انکار کر دیا تو دن رات ان بیٹا مرحوم ڈی سی صاحب کو یاد کر کے روتے رہے۔ ان کے ایک فون سے وہ بات بن جاتی جو پروفیسر فخر کے کئی پھیروں سے نہ بنی۔

امی تو دبی زبان میں کئی بار یہاں تک کہہ چکی تھیں کہ ایسا امداد کس کام کا جس کی سفارش ہی شہر میں نہ چلے۔ نتیجے کے طور پر اظہر نے پڑھائی کا سلسلہ منقطع کر لیا۔ پروفیسر صاحب نے بہت سمجھایا پر اُس کے پاس تو باپ کی نشانی ایک موٹر سائیکل تھا۔ چند ایک دوست تھے جو سول لائنز میں رہتے تھے۔ وہ بھلا کیا کالج وا لج جاتا!

اس سارے ماحول میں پروفیسر فخر کیچڑ کا کنول تھے۔

لمبے قد کے دُبلے پتلے پروفیسر ــــ سیاہ آنکھیں جن میں تجسس اور شفقت کا ملا جلا رنگ تھا۔ انہیں دیکھ کر خدا جانے کیوں ریگستان کے گلّہ بان یاد آ جاتے۔ وہ اُن لوگوں کی طرح تھے جن کے آدرش وقت کے ساتھ دھندلے نہیں پڑ جاتے ــــ جو اس لیے محکمۂ تعلیم میں نہیں جاتے کہ اُن سے سی ایس پی کا امتحان پاس نہیں ہو سکتا یا وہ دولت کمانے کے کوئی ہنر گر نہیں جانتے۔ انھوں نے تو تعلیم و تدریس کا پیشہ اس لیے چُنا تھا کہ انھیں نوجوانوں

کی پُر تجسس آنکھیں پسند تھیں۔ انہیں فسٹ ایئر کے وہ لڑکے بہت اچھے لگتے تھے جو گاؤں سے آتے تھے اور آہستہ آہستہ شہر کے رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ ان کے چہروں سے جو ذہانت ٹپکتی تھی، دھرتی کے قریب رہنے کی وجہ سے ان میں جو دو اور دو چار قسم کی عقل تھی پروفیسر فخر انہیں صیقل کرنے میں بڑا لطف حاصل کرتے تھے۔

وہ تعلیم کو میلاد النبیؐ کا فنکشن سمجھتے۔ جب گھر گھر دیے جلتے ہیں اور روشنی سے خوشی کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان کے ساتھی پروفیسر جب سٹاف روم میں بیٹھ کر خاص HAVE - NOTS کے انداز میں نو دولتی سوسائٹی پہ تبصرہ کرتے تو وہ خاموش رہتے کیونکہ ان کا مسلک ٹوٹی پانچر کا مسلک تھا۔ کوٹلس کا مسلک تھا۔ ان کے دوست جب فسٹ کلاس، سیکنڈ کلاس اور سلیکشن گریڈ کی باتیں کرتے تو پروفیسر فخر منہ بند کیے اپنے ہاتھوں پہ نگاہیں جما لیتے۔ وہ تو اس زمانے کی نشانیوں میں سے رہ گئے تھے جب شاگرد اپنے استاد کے برابر بیٹھ نہ سکتا تھا۔ جب استاد کے آشیرباد کے بغیر شانتی کا تصور بھی گناہ تھا۔ جب استاد خود کبھی حصولِ دولت کے لیے نہیں نکلتا تھا لیکن تاجدار اس کے سامنے دو زانو آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ جب وہ شاہ جہانگیر کے دربار میں میاں میرؒ صاحب کی طرح کہتا کہ:

"اے شاہ! آج تو بلا لیا ہے پر اب شرطِ عنایت یہی ہے کہ پھر کبھی نہ بلانا۔"

جب استاد کہتا:

"اے حاکمِ وقت! سورج کی روشنی چھوڑ کر کھڑا ہو جا۔"

جب بی بی نے پہلی بار پروفیسر فخر کو دیکھا تھا تو فخر کی نظروں کا مجذوبانہ حُسن شہد کی مکھیوں جیسا جذبۂ خدمت اور صوفیائے کرام جیسا اندازِ گفتگو اسے لے ڈوبا۔ بی بی ان لوگوں میں سے تھی جو درخت سے مشابہ ہوتی ہیں۔ درخت چاہے کیسا ہی آسمان کو چھونے لگے، بالآخر مٹی کے خزانوں کو نچوڑتا ہی رہتا ہے۔ وہ چاہے کتنا ہی چھتنارہ کیوں نہ ہو، بالآخر

اس کی جڑوں میں نیچے اترتے رہنے کی ہوس باقی رہتی ہے —— اور پھر پروفیسر کا آدرش کوئی مانگے کا کپڑا تو تھا نہیں کہ مستعار لیا جاتا لیکن بی بی تو ہوا میں جھولنے والی ڈالیوں کی طرح یہی سوچتی رہی کہ اس کا دھرتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ ہوا پر زندہ رہ سکتی ہے۔ محبت ان کے لیے کافی ہے۔

تب اباجی زندہ تھے اور ان کے پاس شیشوں والی کار تھی جس روز وہ بی۔ اے کی ڈگری لے کر یونیورسٹی ہال سے نکلی تو اس کے اباجی ساتھ تھے۔ ان کی کار رش کی وجہ سے عجائب گھر کی طرف کھڑی تھی۔ مال کو کراس کر کے جب وہ دوسری جانب پہنچے تو فٹ پاتھ پر اس نے پروفیسر فخر کو دیکھا۔ وہ جھکے ہوئے اپنی سائیکل کا پیڈل ٹھیک کر رہے تھے۔

"سر سلام علیکم —— !"

فخر نے سر اٹھایا اور ذہین آنکھوں میں مسکراہٹ آگئی۔

"وعلیکم السلام۔ مبارک ہو آپ کو ——"

سیاہ گاؤن میں وہ اپنے آپ کو بہت معزز محسوس کر رہی تھی۔

"سر میں لے چلوں آپ کو ——"

بڑی سادگی سے فخر نے سوال کیا۔ —— "آپ سائیکل چلانا جانتی ہیں؟"

"سائیکل پر نہیں جی —— میرا ..... مطلب ہے کار کھڑی ہے۔ جی میری۔"

فخر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بی بی اس کے کندھے برابر نظر آنے لگی۔

"دیکھیے مس —— استادوں کے لیے کاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے شاگرد کاروں میں بیٹھ کر دنیا کا نظام چلاتے ہیں۔ استادوں کو دیکھ کر کار روکتے ہیں لیکن استاد شاگردوں کی کار میں کبھی نہیں بیٹھتا کیونکہ شاگرد سے اس کا رشتہ دنیاوی نہیں ہوتا۔ استاد کا آسائش سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ مرگ چھالا پر سوتا ہے۔ بڑ کے درخت تلے بیٹھتا اور جَو کی روٹی کھاتا ہے۔"

بی بی کو تو جیسے ہونٹوں پر بھڑ ڈس گئی۔

ابھی چند ثانیے پہلے وہ ہاتھوں میں ڈگری لے کر فُل سائز فوٹو کھنچوانے کا پروگرام بنا رہی تھی اور اب۔ یہ۔ گاؤن، یہ اونچا جوڑا، یہ ڈگری، سب کچھ نفرت انگیز بن گیا۔ جب مال روڈ پر ایک فوٹوگرافر کی دکان کے آگے کار روک کر اباجی نے کہا:

"ایک تو فُل سائز تصویر کھنچوا لو اور ایک پورٹریٹ ..... !"

"ابھی نہیں اباجی! میں پرسوں اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر تصویر کھنچواؤں گی۔"

"صبح کی بات پر ناراض ہو ابھی تک؟" اباجی نے سوال کیا۔

"نہیں جی وہ بات نہیں ہے۔"

صبح جب وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو اباجی نے دبی زبان میں کہا تھا کہ وہ کنووکیشن کے بعد اسے فوٹوگرافر کے پاس نہ لے جا سکیں گے کیونکہ انہیں کمشنر سے ملنا تھا۔ اس بات پر بی بی نے منہ تھتھا لیا تھا —— اور جب تک اباجی نے وعدہ نہیں کر لیا تب تک وہ کار میں سوار نہ ہوئی تھی۔

اب کار فوٹوگرافر کی دکان کے آگے کھڑی تھی۔ اباجی اس کی طرف کا دروازہ کھولے کھڑے تھے لیکن تصویر کھنچوانے کی تمنا آپی آپ مر گئی تھی۔

بی اے کے بعد کالج کا ماحول دُور رہ گیا۔ یہ ملاقات بھی گرد آلود ہو گئی اور غالباً طاقِ نسیاں پر بھی دھری رہ جاتی اگر اچانک کتابوں کی دکان پر ایک دن اسے پروفیسر فخر نظر نہ آجاتے۔ وہ حسبِ معمول سفید قمیص خاکی پتلون میں ملبوس تھے۔ رومن نوز پر عینک ٹکی تھی اور وہ کسی کتاب کا غور سے مطالعہ کر رہے تھے۔ بی بی اپنی دو تین سہیلیوں کے ساتھ دکان میں داخل ہوئی —— اسے ویمن ایڈ ہوم قسم کے رسالے درکار تھے۔ عید کارڈ اور سیچ کرافٹ کے پمفلٹ خریدنے تھے۔ لوکیری ڈائجسٹ قسم کی ایسی کتابوں کی تلاش تھی جو سالوں میں بڑھایا ہوا وزن ہفتوں میں گھٹا دینے کے مشورے جانتی ہیں لیکن اندر گھستے ہی گویا آئینے کا لشکارا پڑا۔

"سلام علیکم سر —"

"وعلیکم السلام —" مٹھو کے بھکشو نے جواب دیا۔

"آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں سر — میں آپ کی سٹوڈنٹ ہوں جی — قمر زبیری —"

اس نے دوستوں کی طرف خفت سے دیکھ کر کہا۔

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے قمر بی بی — کیا کر رہی ہیں آپ ان دنوں؟"

"میں جی — کچھ نہیں جی — سر!"

ایک سہیلی نے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسری نے کمر میں چٹکی کاٹی لیکن وہ تو اس طرح کھڑی تھی گویا کسی فلم سٹار کے آگے آٹو گراف لینے کھڑی ہو۔

"آپ ایم اے نہیں کر رہی ہیں پولیٹکل سائنس میں؟"

"اس کی تو شادی ہو رہی ہے سر۔"

کھی کھی کر کے ساری کبوتر زادیاں ہنس دیں۔

بی بی نے قاتلانہ نظروں سے سب کو دیکھا اور بولی: "جھوٹ بولتی ہیں جی — میں تو جی ایم اے کروں گی۔"

اب پروفیسر مکمل پروفیسر بن گیا۔ جوان چہرے پر بڑھاپے کی متانت آ گئی۔

"دیکھیے۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کا وہ رول نہیں ہے جو آجکل کی لڑکیاں ادا کر رہی ہیں۔ آپ کو شادی کے بعد یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تعلیم سونے کا زیور نہیں ہے جسے بنک کے لاکرز میں بند کر دیا جاتا ہے بلکہ یہ تو جادو کی وہ انگوٹھی ہے جسے جس قدر رگڑتے چلے جاؤ اسی قدر خوشیوں کے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔ آپ کو اس تعلیم کی زکوٰۃ دینا ہوگی۔ اسے دوسروں کے ساتھ SHARE کرنا ہوگا۔"

بات بہت معمولی اور سادہ تھی۔ اس نوعیت کی باتیں عموماً عورتوں کے رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں لیکن فخر کی آنکھوں میں، اس کی باتوں میں وہ حسن تھا جو ہمیشہ سچائی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ پمفلٹ اور وزن گھٹانے کی تین کتابیں خرید کر کار میں آ بیٹھی تو اس کی نظروں میں وہی چہرہ تھا، وہی بھیگی بھیگی آواز تھی۔

پروفیسر فخر کو دیکھنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی لیکن اس کی آواز کی لہریں اسے ہر لحظہ زیر آب کیے دیتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے، وہی شکاری کتے جیسا ستا ہوا چہرہ، اندر کو دھنسی ہوئی چمکدار آنکھیں اور خشک ہونٹ نظروں کے آگے گھومنے لگے۔ پھر یہ چہرہ بھلائے نہ بھولتا اور وہ اندر ہی اندر بل کھائی رسّی کی طرح مروڑی جاتی۔

ان ہی دنوں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پولیٹکل سائنس میں ایم اے کرے گی۔ حالانکہ اس کے گھر والے ایک اچھے بر کی تلاش میں تھے۔ ہاتھی مرا ہوا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر ریٹائر ہو کر بھی اونچی پشت والی کرسی سے مشابہ ہوتا ہے۔ ابا جی کے مال و متاع کو گو اندر سے گھن لگ چکا تھا لیکن حیثیت عرفی بہت تھی۔ نوکر چاکر کم ہو گئے تھے۔ سوشل لائف بھی پہلے سی نہ رہی تھی۔ فنکشنوں کے کارڈ بھی کم ہی آتے لیکن رشتے ڈی سی صاحب کی بیٹی کے چلے آ رہے تھے اور اعلیٰ سے اعلیٰ آ رہے تھے۔ اس کی امی گو پڑھی لکھی عورت نہ تھی لیکن بااثر بارسوخ خواتین کی صحبت نے اسے خوب صیقل کر دیا تھا۔ اس میں ایک ایسی خوش اعتمادی اور پُرکاری پیدا ہو گئی تھی کہ کالجوں کی پروفیسریں اس کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کمتر سمجھا کرتیں۔

جس وقت بی بی نے پولیٹکل سائنس کرنے پر ضد کی تو امی نے زبردست مخالفت کی ابا جی نے قدم قدم پر یہ اڑچن پیدا کی کہ جو لڑکی ہمیشہ پولیٹکل سائنس میں کمزور رہی ہے وہ اس مضمون میں ایم اے کیونکر کرے گی۔ کئی گھنٹوں کی بحثوں کے بعد ابا جی اس بات پر رضامند ہو گئے کہ وہ پروفیسر سے ٹیوشن لے سکتی ہے۔

جس روز ریٹائرڈ ڈی سی صاحب کی کار سمن آباد گئی تو پروفیسر فخر گھر پر موجود نہ تھے۔ دوسری مرتبہ جب بی بی کی امی گئیں تو پروفیسر صاحب کسی سیمینار پر تشریف لے جا چکے تھے۔ ملاقات پھر نہ ہوئی۔ تیسری بار جب بی بی اور ابا جی ٹیوشن کا طے کرنے گئے تو پروفیسر صاحب مونڈھے پر بیٹھے ہوئے مطالعے میں معروف تھے۔ باہر کے نلکے کے ساتھ نیلے رنگ کی پلاسٹک کی ٹیوب لگی ہوئی تھی۔ ٹیوب کا پانی سامنے کے تنگ احاطے میں اکٹھا ہو رہا تھا لیکن پروفیسر صاحب اس سے غافل مٹتی شفق میں حروف ٹٹول ٹٹول کر پڑھ رہے تھے۔

پہلے ابا جی نے ہارن بجایا پھر خانساماں کہہ کر آوازیں دیں۔ نہ تو اندر سے کوئی باورچی قسم کا آدمی نکلا اور نہ ہی پروفیسر صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بالآخر ابا جی نے خفت کے باوجود دروازہ کھولا اور بی بی کو ساتھ لے کر برآمدے کی طرف چلے۔ ٹیوب غالباً دیر سے لگی ہوئی تھی اور مٹی کیچڑ میں بدل چکی تھی۔ بڑی احتیاط سے قدم دھرتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر کھنکار کر پروفیسر صاحب کو متوجہ کیا۔

پونہ گھنٹہ بیٹھے رہنے کے باوجود نہ تو اندر سے کوکا کولا آیا نہ چائے کے برتنوں کا ہی شور سنائی دیا۔ اس بے اعتنائی کے باوجود دونوں باپ بیٹی سہمے سے بیٹھے تھے۔ شام گہری ہو چلی تھی اور سمن آباد کے گھروں کے آگے چھڑکاؤ کرنے میں مشغول تھے۔ قطار صورت گھروں سے ہر سائز اور ہر عمر کا بچہ نکل کر اس چھڑکاؤ کو بطور ہولی استعمال کر رہا تھا۔ عورتیں نائیلون جالی کے دوپٹے اوڑھے آ جا رہی تھیں۔ ایک ایسے طبقے کی زندگی جاری تھی جو نہ امیر تھا اور نہ ہی غریب ــــ دونوں کے درمیان کہیں مرغِ بسمل کی طرح لٹک رہا تھا۔

جب بات پڑھنے پڑھانے تک جا پہنچی تو پروفیسر فخر بولے:

"جی ہاں، میں انہیں پڑھا دوں گا۔ بخوشی۔"

اب پہلو بدل کر ریٹائرڈ ڈی سی صاحب نے کہا ـــ "معاف کیجیے پروفیسر صاحب! لیکن بات پہلے ہی واضح ہونی چاہیے ـــ یعنی آپ ـــ میرا مطلب ہے آپ کی RENUMERATION کیا ہوگی؟"

ٹیوشن کی فیس کو خوبصورت سے انگریزی لفظ میں ڈھال کر گویا ڈی سی صاحب نے اس میں سے ذلّت کی پھانس نکال دی۔

لیکن پروفیسر صاحب کا رنگ متغیّر ہو گیا اور وہ مونڈھے کی پشت کو دیوار سے لگا کر بولے:

"میں ـــ مجھے ـــ دراصل مجھے گورنمنٹ پڑھانے کا عوضانہ دیتی ہے سر۔ اُس کے علاوہ ـــ میں ٹیوشن نہیں کرتا ـــ تعلیم دیتا ہوں۔ جو چاہے جب چاہے مجھ سے پڑھ سکتا ہے۔"

"لیکن یہ تو آپ کی آفیشل ڈیوٹی نہیں ہے سر ـــ یہ تو ـــ!"

"دیکھیے جناب۔ میں اس لیے پڑھاتا ہوں کہ مجھے پڑھانے کا شوق ہے۔ اگر میں تحصیلدار ہوتا تو بھی پڑھاتا۔ اگر ضلع کا ڈی سی ہوتا تو بھی پڑھاتا۔ کچھ لوگ پیدائشی میری طرح ہوتے ہیں۔ ان کے ماتھے پر مہر ہوتی ہے پڑھانے کی ـــ ان کے ہاتھوں پر لکیر ہوتی ہے پڑھانے کی۔"

بی بی کے حلق میں نمکین آنسو آ گئے۔

دو غیرتوں کا مقابلہ تھا۔ ایک طرف ڈی سی صاحب کی وہ غیرت تھی جسے ہر ضلع کے افسروں نے کلف لگائی تھی۔ دوسری جانب ایک IDEALIST آدمی کی غیرت تھی جو گھونگھے کی طرح اپنا سارا گھر اپنے ہی جسم پہ لاد کر چلا کرتا ہے اور ذرا سی آہٹ پا کر اس گھونگھے میں گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب بڑی بھلی سی باتیں کیے جا رہے تھے اور اس کے ابا جی مونڈھے

میں یوں بیٹھے تھے جیسے بھاگ جانے کی تدبیریں سوچ رہے ہوں۔

"فائن آرٹس کا دولت کی ذخیرہ اندوزی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرا پروفیشن فائن آرٹس کا ایک شعبہ ہے۔ انسان میں کلچر کا شعور پیدا کرنے کی سعی — انسان میں تحصیلِ علم کی خواہش کا بیدار کرنا — عام سطح سے اٹھ کر سوچنا اور سوچتے رہنا — ایک صحیح استاد ان نعمتوں کو بیدار کرتا ہے۔ ایک تصویر، ایک گیت، ایک خوبصورت بُت بھی یہی کچھ کر پاتے ہیں۔ ساز بجانے والے کو اگر آپ لاکھ روپیہ دیں اور اس پر پابندی لگائیں کہ وہ ساز کو ہاتھ نہ لگائے گا تو غالباً وہ — اگر وہ GENUINE ہے تو آپ کی پیش کش ٹھکرا دے گا۔ میں ٹیچر ہوں۔ GENUINE ٹیچر — میں FAKE نہیں ہوں — زبیری صاحب —!"

ڈی سی صاحب اپنی بیٹی کے سامنے ہار ماننے والے نہ تھے:

"اور جو پیٹ میں کچھ نہ ہو تو غالباً سازندہ مان جائے گا۔"

"پھر وہ ساز نواز FAKE ہوگا۔ PASSION کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ غالباً وہ اپنے آرٹ کو ایک تمغہ، ایک پاسپورٹ، ایک اشتہار کی طرح استعمال کرتا ہوگا۔"

"اچھا جی آپ پیسے نہ لیں لیکن بی بی کو پڑھا تو دیا کریں۔"

"جی ہاں۔ بخوشی پڑھا دوں گا۔"

"تو کب آیا کریں گے آپ؟ — میں کار بھجوا دیا کروں گا۔"

پروفیسر فخر کی آنکھیں تنگ ہو گئیں اور وہ ہچکچا کر بولے — "میں تو کہیں نہیں جاتا شام کے وقت —"

"تو میرا — تو میرا مطلب ہے کہ آپ اسے پڑھائیں گے کیسے؟"

"یہ چار سے پانچ کے درمیان کسی وقت آجایا کریں۔ میں پڑھا دیا کروں گا۔"

بی بی کے پیروں تلے سے یوں زمین نکلی کہ اس وقت تک واپس نہ لوٹی جب تک وہ اپنے پلنگ پر لیٹ کر کئی گھنٹے تک آنسوؤں سے اشنان نہ کرتی رہی۔

عورت کے لیے عموماً مرد کی کشش کے تین پہلو ہوتے ہیں:

بے نیازی

ذہانت اور

فصاحت

یہ تینوں اوصاف پروفیسروں میں بقدرِ ضرورت ملتے ہیں۔ اسی لیے ایسے کالجوں میں جہاں مخلوط تعلیم ہو لڑکیاں عموماً اپنے پروفیسروں کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں — اس محبت کا چاہے کچھ نتیجہ نہ نکلے لیکن ہیرو ورشپ کی طرح اس کا اثر ان کے ذہنوں میں ابدی ہوتا ہے جس طرح ملکیت ظاہر کرنے کے لیے پرانے زمانے میں گھوڑوں کو داغ دیا جاتا تھا اسی طرح اس رات بی بی کے دل پر مہرِ فخر لگ گئی۔

ابا جی ہر آنے جانے والے سے پروفیسر فخر کے احمق پن کی داستان یوں سنانے بیٹھ جاتے جیسے یہ بھی کوئی ویت نام کا مسئلہ ہو۔ اُن کے ملنے والے پروفیسر فخر کی باتوں پہ خوب ہنستے۔ بی بی کو شبہ ہو چلا تھا کہ انھوں نے بیٹی کو ٹیوشن کی اجازت نہ دی تھی پھر بھی اندر ہی اندر ابا جی فخر کی شخصیت سے مرعوب ہو چکے ہیں۔

ایک دن جب بی بی اپنی ایک سہیلی سے ملنے سمن آباد گئی اور سامنے والی لائن میں اسے پروفیسر فخر کا مکان دکھائی دیا تو اچانک اس کے دل میں ایک زبردست خواہش اٹھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس وقت پروفیسر صاحب کالج جا چکے ہوں گے۔ پھر بھی وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ سارے کمرے کھلے پڑے تھے۔ ملبے کمرے میں ایک چارپائی بچھی تھی جس کا ایک

پایہ غائب تھا اور اس کی جگہ اینٹوں کی تھئی لگی ہوئی تھی۔ تینوں کمروں میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ہر سائز، ہر پیپر اور ہر طرح کی پرنٹنگ والی کتابیں۔ ان کتابوں کو ورنگی کے ساتھ آراستہ کرنے کی خواہش بڑی شدت کے ساتھ بی بی کے دل میں اٹھی۔

جستی ٹرنک پر پڑے ہوئے کپڑے، زرد رو چھپکلیاں جو بڑی آزادی سے چھت پر سے جہاں تک رہی تھیں اور کونوں میں لگے ہوئے جالے۔ ان چیزوں کا بی بی پر بہت گہرا اثر ہوا۔ باورچی خانے سے کچھ جلنے کی خوشبو آ رہی تھی لیکن پکانے والا دیگچی سٹوو پہ رکھ کر کہیں گیا ہوا تھا۔ بی بی نے تھوڑا سا پانی دیگچی میں ڈالا اور سہیلی سے ملے بغیر گھر آ گئی۔

جس روز بی بی نے پروفیسر فخر سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اسی روز جمالی ملک کا رشتہ بھی آ گیا۔

جمالی ملک لاہور کے ایک نامی گرامی ہوٹل میں مینیجر تھے۔ بڑی پریس کی ہوئی شخصیت تھی اپنی پتلون کی کریز کی طرح۔ اپنے چمکدار بوٹوں کی طرح جگمگاتی ہوئی شخصیت ـــــ وہ کسی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار نظر آتے تھے۔ صاف ستھرے دانتوں کی چمک ہمیشہ چہرے پر رہتی تھی ـــــ

جمالی ملک اپنے ہوٹل کی طرح تنظیم، صفائی اور سروس کا سمبل تھے۔

ایئر کنڈیشنڈ لابی میں پھرتے ہوئے، مدھم بتیوں والی بار میں سرپرائز وزٹ کرتے ہوئے لفٹ کے بٹن دباتے ہوئے، ڈائننگ ہال میں وی آئی پیز کے ساتھ پُر تکلف گفتگو کرتے ہوئے، ان کا وجود کٹ گلاس کے فانوس کی طرح خوبصورت اور چمکدار تھا۔

جس روز اس بڑے ہوٹل کے بڑے مینیجر نے بی بی کے خاندان کو کھانے کی دعوت دی، اسی روز ڈرائی کلینرز سے واپسی پر بی بی کی مڈبھیڑ پروفیسر فخر کے ساتھ ہو گئی۔ وہ فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں والی دکانوں کے سامنے کھڑے تھے اور ایک پرانا سا مسودہ دیکھ رہے تھے۔

ان سے پانچ چھ قدم دور "ہر مال ملے گا آٹھ آنے" والا چیخ چیخ کر سب کو بلا رہا تھا۔ ذرا ساہٹ کر وہ دکان تھی جس میں سرخ چونچوں والے، ہریل طوطے، سرخ افریقہ کی چڑیاں اور خوبصورت لقے کبوتر غٹر غوں غٹر غوں کر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب پر سارے بازار کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا اور وہ بڑے انہماک سے پڑھنے میں مشغول تھے۔ کار پارک کرنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ بالآخر محکمۂ تعلیم کے دفتر میں جا کر پارک کروائی اور خود پیدل چلتی ہوئی پروفیسر فخر تک جا پہنچی۔

پرانی کتابیں بیچنے والے دُور تک پھیلے تھے۔ کرم خوردہ کتابوں کے ڈھیر تھے۔ ایسی کتابیں اور رسالے بھی تھے جنہیں امریکن وطن لوٹنے سے پہلے سیروں کے حساب سے بیچ گئے تھے اور جن کے صفحے بھی ابھی کھلے نہ تھے!

"سلام علیکم سر ـــــ!"

چونک کر سر نے پیچھے دیکھا تو بی بی شرمندہ ہو گئی ـــــ اللہ! اس پروفیسر کی آنکھ میں کبھی تو پہچان کی کرن جاگے گی؟ ہر بار نئے سرے سے اپنا تعارف تو نہ کروانا پڑے گا۔

"آپ اتنی دھوپ میں کھڑے ہیں سر ـــــ"

پروفیسر نے جیب سے ایک بوسیدہ اور گندہ رومال نکال کر ماتھا صاف کیا اور آہستہ سے بولے۔ "ان کتابوں کے پاس آ کر گرمی کا احساس باقی نہیں رہتا۔"

بی بی کو عجیب شرمندگی سی محسوس ہوئی کیونکہ جب کبھی وہ پڑھنے بیٹھتی تو ہمیشہ گردن پر پسینے کی نمی سی آ جاتی اور اسے پڑھنے سے الجھن ہونے لگتی۔

"آپ کو کہیں جانا ہو تو ـــــ جی میں چھوڑ آؤں آپ کو۔"

"نہیں۔ میرا سائیکل ہے ساتھ ـــــ شکریہ!"

بات کچھ بھی نہ تھی۔ فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کی دکان کے سامنے ایک بے نیاز چھوٹے پروفیسر کے ساتھ جس کے کالر پر میل کا نشان تھا، ایک سرسری سی ملاقات تھی چند ثانیے بھر کی

لیکن اس ملاقات کا بی بی پہ تو عجیب اثر ہوا۔ سارا وجود تحلیل ہو کر ہوا میں مل گیا۔ کندھوں پر سر نہ رہا ——— اور پاؤں میں چلنے کی سکت نہ رہی۔ حالانکہ پروفیسر فخر نے اس سے ایک بات بھی ایسی نہ کی جو بظاہر توجہ طلب ہوتی۔ پر بی بی کے تو ماتھے پر جیسے انھوں نے اپنے ہاتھ سے چندن کا ٹیکہ لگا دیا۔ کھوئی کھوئی سی گھر آئی اور غائب سی بڑے ہوٹل پہنچ گئی۔

جب وہ شموز کی ساڑھی پہنے آئینہ خانے سے لابی میں پہنچی تو دراصل وہ آکسیجن کی طرح ایک ایسی چیز بن چکی تھی جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جمالی ملک صاحب شارک سکن کے سوٹ میں ملبوس، کالر میں کارنیشن کا پھول لگائے گھٹنوں پہ کلف شدہ سرویٹ رکھے اتنے ٹھوس نظر آ رہے تھے کہ سامنے میز پر کہنیاں ٹکائے جھینگے کا پلاؤ اور چوپ سوئی کھانے والی لڑکی پر انہیں شبہ تک نہ ہو سکا اور وہ جان ہی نہ سکے کہ مسلسل باتیں کرنے والی لڑکی دراصل ہوٹل میں موجود ہی نہیں ہے۔

اگر بی بی کی شادی جمالی ملک سے ہو جاتی تو کہانی آٹھ تہ کے کیک کی طرح دلآویز ہوتی۔ لفٹ کی طرح اوپر کی منزلوں کو چڑھنے والی، سوئمنگ پول کے اس تختے کی طرح جس پہ چڑھ کر ہر تیرنے والا سمر سولٹ کرنے سے پہلے کئی فٹ اوپر چلا جایا کرتا ہے۔

لیکن ———

شادی تو بی بی کی پروفیسر فخر سے ہو گئی۔

ڈی سی صاحب کی بیٹی کا بیاہ اس کی پسند کا ہوا اور اس شادی کی دعوت اس ہوٹل میں دی گئی جس کے مینیجر جمالی صاحب تھے۔ دلہن کے گھر والوں نے چار ڈی لکس قسم کے کمرے دو دن پہلے سے بک کر رکھے تھے اور بڑے ہال میں جہاں رات کا آرکسٹرا بجا کرتا ہے، وہیں دولہا دلہن کے اعزاز میں بہت بڑی دعوت رہی۔ نکاح بھی ہوٹل ہی میں ہوا اور رخصتی بھی ہوٹل ہی سے ہوئی۔ ساری شادی سے ہنگامہ مفقود تھا۔ ایک ٹھنڈک کا، ایک خاموشی کا احساس مہمانوں پہ طاری تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہال میں یخ بستہ کولڈ ڈرنکز پیتے ہوئے سرد مہر سے

مہمانوں سے مل کر بی بی اپنے میاں کے ساتھ حسن آباد چلی گئی۔

لیکن اس رخصتی سے پہلے ایک اور بھی چھوٹا سا واقعہ ہوا۔

نکاح سے پہلے جب دلہن تیار کی جا رہی تھی اور اسے زیور پہنایا جا رہا تھا اس وقت بجلی اچانک فیوز ہو گئی۔ پہلے بتیاں گئیں۔ پھر ایئر کنڈیشنر کی آواز بند ہو گئی۔ چند ثانیے تو کانوں کو سکون سا محسوس ہوا لیکن پھر لڑکیوں کا گروہ کچھ تو گرمی کے مارے اور کچھ موم بتیوں کی تلاش میں باہر چلا گیا۔

اندھیرے کمرے میں ایک آراستہ دلہن رہ گئی۔ اردگرد خوشبو کا احساس باقی رہا اور باقی سب کچھ غائب ہو گیا۔

بتیاں پورے آدھ گھنٹے بعد آئیں۔

اب خدا جانے یہ جمالی ملک کی سکیم تھی یا واپڈا والوں کی سازش تھی۔ بجلی کے چلے جانے کے کوئی دس منٹ بعد بی بی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈری ہوئی آواز میں بی بی نے جواب دیا:

"کم ان ———"

ہاتھ میں شمعدان لیے جمالی ملک داخل ہوا۔

اس نے آدھی رات جیسا گہرا نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کالر میں سرخ کارنیشن کا پھول تھا اور اس کے آتے ہی تمباکو ملی کوئی تیز سی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔

بی بی کا دل زور زور سے بجنے لگا۔

"میں یہ بتانے آیا تھا کہ ہمارا جنریٹر خراب ہو گیا ہے تھوڑی دیر میں بجلی آ جائے گی ——— کسی چیز کی ضرورت تو نہیں آپ کو؟"

وہ خاموش رہی۔

"میں یہ کینڈل سٹینڈ آپ کے پاس رکھ دوں؟"

اثبات میں بی بی نے سر ہلا دیا۔

جمالی ملک نے شمعدان ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

جب پانچ موم بتیوں کا عکس بی بی کے چہرے پہ پڑا اور کنکھیوں سے اس نے آئینے کی طرف دیکھا تو لمحہ بھر کو تو اپنی صورت دیکھ کر وہ خود حیران سی رہ گئی۔

"آپ کی سہیلیاں کدھر گئیں؟"

"وہ نیچے چلی گئی ہیں شاید ___"

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ___ تو میں یہاں بیٹھ جاؤں چند منٹ"

بی بی نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اپالو کی طرح وجیہہ تھا۔ جب اس نے ایک گھٹنے پہ دوسرا گھٹنا رکھ کر سر کو صوفے کی پشت سے لگایا تو بی بی کو عجیب قسم کی کشش محسوس ہوئی۔ جمالی ملک کے ہاتھ میں سارے ہوٹل کی ماسٹر چابیاں تھیں اور اس کی بڑی سی انگوٹھی نیم روشنی میں چمک رہی تھی۔

اس خاموش خوبصورت آدمی کو بی بی نے اپنے نکاح سے آدھ گھنٹہ پہلے پہلی بار دیکھا اور اس کی ایک نظر نے اسے اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا جیسے سیاہی چوس سیاہی کو جذب کرتا ہے۔

"میں آپ کو مبارکباد پیش کر سکتا ہوں؟ ___" اس نے مضطرب نظروں سے بی بی کو دیکھ کر پوچھا۔

وہ بالکل چپ رہی۔

"لڑکیاں ___ خاص کر آپ جیسی لڑکیوں کو ایک بڑا زعم ہوتا ہے اور اسی ایک زعم کے ہاتھوں وہ ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھتی ہیں۔"

نقلی پلکوں والے بوجھل پپوٹے اٹھا کر بی بی نے پوچھا ___ "کیسی غلطی؟"

"کچھ لڑکیاں محض رشی سادھوؤں کی تپسیا توڑنے کو خوشی کی معراج سمجھتی ہیں۔

وہ سمجھتی ہیں کہ کسی بے نیاز کی ڈھال میں سوراخ کر کے وہ سکون کی معراج کو پالیں گی۔ کسی کے تقوے کو برباد کرنا خوشی کے مترادف نہیں ہے۔ کسی کے زہد کو عجز و انکساری میں بدل دینا کچھ اپنی راحت کا باعث نہیں ___ ہاں دوسروں کے لیے احساسِ شکست کا باعث ہو سکتی ہے یہ بات ___"

چابیاں ہاتھ میں گھوم پھر رہی تھیں۔ ذہانت اور فصاحت کا دریا رواں تھا۔

"یہ زعم ___ عورتوں میں، لڑکیوں میں کب ختم ہوگا! ___ میرا خیال تھا آپ ذہین ہیں لیکن آپ بھی وہی غلطی کر بیٹھی ہیں جو عام لڑکی کرتی ہے ___ آپ بھی تو بت شکن بننا چاہتی ہیں ___"

"مجھے ___ مجھے پروفیسر فخر سے محبت ہے۔"

"محبت ___؟ آپ پروفیسر فخر کو یہ بتانا چاہتی ہیں کہ اندر سے وہ بھی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں۔ اپنے تمام آئیڈیلز کے باوجود وہ بھی کھانا کھاتے ہیں۔ سوتے ہیں ___ اور محبت کرتے ہیں ___ ان کا کورٹ آف آرمر اتنا سخت نہیں جس قدر وہ سمجھتے ہیں!"

وہ چاہتی تھی کہ جمالی ملک سے کہے تم کون ہوتے ہو مجھے پروفیسر فخر کے متعلق کچھ بتانے والے! تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ یہاں لیدر کے صوفے سے پشت لگا کر سارے ہوٹل کی ماسٹر چابیاں ہاتھ میں لیے اتنے بڑے آدمی پہ تبصرہ کرو ___ لیکن وہ بے بس سنے جا رہی تھی اور کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

"میں پروفیسر صاحب سے واقف نہیں ہوں لیکن جو کچھ سنا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ ___ وہ اگر مجرد رہتے تو بہتر ہوتا ___ عورت تو خواہ مخواہ توقعات وابستہ کر لینے والی شے ہے ___ وہ بھلا اس صنف کو کیا سمجھ پائیں گے؟"

"جمالی صاحب! ——" اس نے التجا کی۔

"آپ سی لڑکیاں اپنے رفیقِ حیات کو اس طرح چُنتی ہیں جس طرح مینوؤں سے کوئی اجنبی نام کی ڈش آرڈر کر دی جائے۔ محض تجربے کی خاطر —— محض تجسّس کے لیے ——"

وہ پھر بھی چُپ رہی۔

"اتنے سارے حسن کا پروفیسر صاحب کو کیا فائدہ ہوگا بھلا —— منی پلانٹ پانی کے بغیر سُوکھ جاتا ہے۔ عورت کا حسن پرستش اور ستائش کے بغیر مرجھا جاتا ہے —— کسی ذہین مرد کو بھلا کسی خوبصورت عورت کی کب ضرورت ہوتی ہے؟ اس کے لیے تو کتابوں کا حسن بہت کافی ہے۔"

شمعدان اپنی پانچ موم بتیوں سمیت دم سادھے جل رہا تھا اور وہ کیوٹیکس لگے ہاتھوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"مجھ سے بہتر قصیدہ گو آپ کو کبھی نہیں مل سکتا قمر —— مجھ سا گھر آپ کو نہیں مل سکتا کیونکہ میرا گھر اس ہوٹل میں ہے اور ہوٹل سروس سے بہتر کوئی سروس نہیں ہوتی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میری باتوں پر آپ کو اس وقت یقین آئے گا جب آپ کے چہرے پر چھائیاں پڑ جائیں گی۔ ہاتھ کیکر کی چھال جیسے ہو جائیں گے اور پیٹ چھاگل میں بدل جائے گا —— میں تو چاہتا تھا —— میری تو تمنا تھی کہ جب ہم اس ہوٹل کی لابی میں اکٹھے پہنچتے۔ جب اس کی بار میں ہم دونوں کا گزر ہوتا۔ جب اس کی گیلریوں میں ہم چلتے نظر آتے تو امریکن ٹورسٹ سے لے کر پاکستانی بیٹی بو تک سب، ہماری خوش نصیبی پر رشک کرتے لیکن آپ آئیڈیلسٹ بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ حسن کے لیے گڑھا ہے بربادی کا۔"

ساون کی رات جیسا گہرا نیلا سوٹ، کارنیشن کا سرخ پھول اور آفٹر شیو لوشن سے بسا ہوا چہرہ بالآخر دروازے کی طرف بڑھا اور بڑھتے ہوئے بولا:

"کسی سے آئیڈیلز مستعار لے کر زندگی بسر نہیں ہو سکتی محترمہ —— آدرش جب تک اپنے ذاتی نہ ہوں ہمیشہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں کا پودا ریگستانوں میں نہیں لگا کرتا۔"

اس میں تو اتنا حوصلہ بھی باقی نہ رہا تھا کہ آخری نظر جمالی ملک پر ہی ڈال لیتی۔

دروازے کے مدوّر ہینڈل پر ہاتھ ڈال کر جمالی ملک نے تھوڑا سا پٹ کھول دیا۔ گیلری سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آنے لگی:

"میں بھی کس قدر احمق ہوں۔ اس سے اپنا کیس PLEAD کر رہا ہوں جو کبھی کا فیصلہ کر چکی ہے —— اچھا جی مبارک ہو آپ کو ——"

دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

جلتے ہوئے وجیہہ مینیجر کو ایک نظر بی بی نے دیکھا اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتی ہوئی اس نے نظریں جھکا لیں۔

چند لمحوں بعد دروازہ پھر کھلا اور ادھ کھلے پٹ سے جمالی ملک نے چہرہ اندر کر کے دیکھا۔ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں نمی اور شراب کی ملی جلی چمک تھی جیسے گلابی شیشے پر آہوں کی بھاپ اکٹھی ہو گئی ہو۔

"مجھ سے بہتر آدمی تو آپ کو مل رہا ہے —— لیکن مجھ سے بہتر گھر نہ ملے گا آپ کو مغربی پاکستان میں۔"

اسی طرح سنتو جمعدارنی کے جانے پر بی بی نے سوچا تھا۔ ہم سے بہتر گھر کہاں ملے گا کلموہی کو۔ اسی طرح خورشید کے چلے جانے پر وہ دل کو سمجھاتی تھی کہ اس بدبخت کو اس سے اچھا گھر کہاں ملے گا اور ساتھ ساتھ بی بی یہ بھی جانتی تھی کہ اس سے بہتر گھر چاہے نہ ملے وہ لوٹ کر

آنے والیوں میں سے نہیں تھیں۔ اتنے برس گزرنے کے بعد آج ایک پُل تعمیر ہو گیا آپ ہی آپ ماضی سے جوڑنے والا۔ وہ دل برداشتہ انارکلی چلی گئی ـــــ اس کا خیال تھا کہ دو چار گھنٹے کی غیر موجودگی سب کچھ ٹھیک کر دے گی۔ ستو جمعدارنی اور خورشید تک کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

لیکن ہوا یوں کہ جب وہ اپنے اکلوتے دس روپے کے نوٹ کو ہاتھ میں لیے بانو بازار میں کھڑی تھی اور سامنے ربڑ کی چپلوں والے سے بھاؤ کر رہی تھی اور نہ چپلوں والا پونے تین سے نیچے اترتا تھا اور نہ وہ ڈھائی روپے سے اوپر چڑھتی تھی، عین اس وقت ایک سیاہ کار اس کے پاس آ کر رکی۔

اپنے پرانی پھٹے پیروں کو نئی چپل میں پھنساتے ہوئے اس نے ایک نظر کار والے پہ ڈالی۔

وہ اپالو کے بت کی طرح وجیہ تھا۔

کنپٹیوں کے قریب پہلے چند سفید بالوں نے اس کی وجاہت پہ رعب حسن کی مہر بھی لگا دی تھی۔ وقت نے اس سینٹ کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔ وہ اسی طرح محفوظ تھا جیسے ابھی ابھی کولڈ سٹوریج سے نکلا ہو۔

بی بی نے اپنے کیکر کے چھال جیسے ہاتھ دیکھے ـــــ

پیٹ پر نظر ڈالی جو چھاگل میں بدل چکا تھا ـــــ

اور ان نظروں کو جھکایا جن میں اب کتیرہ گوند کی بجھی بجھی سی چمک تھی ـــــ

جمالی ملک اس کے پاس سے گزرا لیکن اس کی نظروں میں پہچان کی گرمی نہ سلگی۔

واپسی پر وہ پروفیسر صاحب سے آنکھیں چرا کر بستر پر لیٹ گئی اور آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب اس کی آنکھوں سے بہ نکلا۔

پروفیسر صاحب نے بہت پوچھا لیکن وہ انہیں کیا بتاتی کہ درخت چاہے کتنا ہی اونچا

کیوں نہ چلا جائے اس کی جڑیں ہمیشہ زمین کو ہوس سے کریدتی رہتی ہیں۔ وہ انہیں کیا سمجھاتی کہ آئیڈیلز کچھ مانگے کا کپڑا نہیں جو پہن لیا جائے۔

وہ انہیں کیا کہتی کہ عورت کیسے توقعات وابستہ کرتی ہے ـــــ

اور ـــــ

یہ توقعات کا محل کیونکر ٹوٹتا ہے؟

وہ غریب پروفیسر صاحب کو کیا سمجھاتی!

ایسی باتیں تو غالباً اب جمالی ملک بھی بھول چکا تھا۔

ـــــ

پسپائی

ساتھ والے کمرے سے چیخ کر منّی نے پوچھا:

"آپا ــــ ! اِندکے کیا معنی جی ؟"

"اِندکے ؟"

"جی ہاں اِندکے ! کیا معنی ہوئے بھلا ؟"

"تھوڑی ؟"

"تھوڑی ــــ یعنی تھوڑی چیز ؟ ــــ کیوں آپا یہی نا ! ــــ" منّی نے چیختی ہوئی آواز میں پھر پوچھا۔

"چلو یوں ہی سمجھ لو" ــــ صوفیہ نے اکتا کر کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس نے نیلے لفافے پر نگاہیں گاڑ دیں اور ماتھے پر اَن گنت تیوریاں ڈال کر پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

"آپا ــــ آپا اس کے کیا معنی ہیں، ہنوز چشمش نگراں است کہ ملکِ بادگراں است"۔ ساتھ والے کمرے سے پھر آواز آئی۔

صوفیہ کی نگاہوں سے جھلاہٹ ظاہر ہونے لگی اور ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

اس نے جھڑکنے کے انداز میں کہا:

"منّی اگر تم کو گلستاں پڑھنا ہے تو ابا کے پاس بیٹھو۔ مجھے فارسی نہیں آتی"۔

منّی اس کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور نیلے سوتی پردوں میں سے جھانکتی ہوئی بولی ــــ "بتا دو نا آپا جی ــــ پرسوں ٹسٹ ہے۔ ہائے اللہ بتا بھی دو"۔

"ابھی تک نگاہ نگرانی کرتی ہے گو ملک کسی اور کی ملکیت ہو چکا ہے ــــ سنا ؟"۔ آپا نے جلدی جلدی لاتعلقی سے کہا۔

"ابھی تک اس کی نگاہ ــــ" منّی رک گئی۔

"نگرانی کرتی ہے۔ گو ملک کسی اور کی ملکیت ہو چکا ہے" ــــ صوفیہ نے دہرایا۔

"جی ــــ شکریہ ــــ چشمش نگراں است کہ ــــ" رٹتی ہوئی منّی رخصت ہو گئی لیکن صوفیہ کے ذہن میں یہ جملہ چکّر لگانے لگا۔ رات کے اندھیرے میں شکستہ مقبرے کے موکھے سے کوئی کبوتر سوتے میں مرقد پر پھڑپھڑانے لگا۔

اس نے گود میں پڑا ہوا نیلا لفافہ کھولا۔ اس کی ملفوف تحریر پڑھی۔ ایک لمحے کے لیے آئینے میں دیکھا اور پھر اپنے ٹرنک کے کپڑے نکالنے میں مشغول ہو گئی۔

صوفیہ کا قد اگر دو انچ لمبا ہوتا تو اس کی چال کا وقار بڑھ جاتا۔ اگر اس کی سانولی صورت ذرا نکھری ہوتی تو اس کی آنکھوں کے سیاہ بھونرے اور بالوں کا ریشمی اندھیرا بڑا دلفریب ہوتا۔ اگر اس کی ناک آگے سے اس قدر پھیلی ہوئی نہ ہوتی تو بھیگے بھیگے ہونٹ بڑے دلآویز نظر آتے ــــ اور پھر اگر اس کی گردن ذرا سی اور اونچی ہوتی تو اس کی ساری شخصیت کا مجموعی تاثر زیادہ جاذبِ نظر ہوتا۔ اس کے گلے میں ایک جیتی جاگتی مینا بیٹھی تھی لیکن کبھی کبھی نہ جانے کیوں اس مینا کی چہکار طوطے کی پکار بن کر رہ جاتی تھی لیکن تعالیوں کہ صوفیہ کی ہر ایک چیز میں بس ایک انچ کی کسر رہ گئی تھی۔

وہ بڑی پیاری سی لڑکی تھی لیکن خوبصورت ہونے کا ارمان اس کے جی ہی جی میں دم

ٹوٹ گیا۔ صوفیہ کو کس کس چیز کا افسوس نہ تھا۔ وہ ناک کے لیے دعا کرے کہ رنگ نکھرنے کی تمنا میں آہیں بھرے۔ گردن لمبی ہو جانے کی آرزو میں مرے کہ درازیٔ قد کے لیے سر بسجود رہے؟ —— یونہی شیشے پر نظر پڑ جانے سے اس کے لبوں سے ایک سرد آہ نکلتی اور ہوا میں اس طرح تحلیل ہو جاتی جیسے پانی میں برف کی کرچی!

"آپا —— آپا جی —— یہ فیکٹر کس فارمولے سے حل کروں؟ ——" نعیم نے اپنی کاپی اس کی ناک تلے کر کے پوچھا۔

صوفیہ نے اپنی بانہوں میں بھرے ہوئے کپڑے پلنگ پہ ڈھیر کیے اور چڑ کر بولی —— "کسی فارمولے سے بھی نہیں"۔

"کسی فارمولے سے بھی نہیں آپا؟" —— نعیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی صاحب کوئی فارمولا نہیں لگے گا۔ اب جائیے ——"

"بتا دو آپا جی —— پلیز آپا۔ ماسٹر جی آتے ہی ہوں گے۔ سوال کیسے حل ہوگا؟ ——" نعیم نے منت کی۔

"حل نہیں ہوگا —— بس نہیں ہوگا۔ دفع ہو جاؤ۔ ایک تو سارے جہان کی پڑھائی اسی گھر میں گھس آئی ہے۔" صوفیہ نے جل کر کہا۔

"کیا آپا؟ ——"

"میں کہتی ہوں اور بچے بھی تو ہوتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے ہیں۔ مزے کرتے ہیں۔ یہاں ایسا چوبیس گھنٹوں کا مکتب کھلا ہے کہ صبح سے شام تک آموختے ہی رٹے جاتے ہیں"۔

"تم ناراض ہو آپا؟ ——" نعیم نے کچھ اس طرح پوچھا کہ صوفیہ مسکرا دی۔

"نہیں بھئی —— لاؤ کاپی ——"

صوفیہ نے ہاتھ بڑھا کر سوال حل کر دیا اور آہستہ سے بولی:

"دیکھو نعیم! فارمولوں سے کچھ نہیں بنتا۔ کتابوں سے کچھ نہیں سنورتا۔ زندگی میں

ایک چیز تجربہ بھی ہے۔ ایک چیز ڈھنگ بھی ہوتی ہے۔ جنہیں تجربے کی روشنی میں زندگی کرنے کا ڈھنگ آ گیا وہ جیت گئے"۔

"کیا کیا کیا؟ ——" نعیم نے منہ کھول کر پوچھا۔

لیکن آپا نے جو بات اپنے آپ سے کہی تھی آگے نہ بڑھائی اور ہنس کر بولی:

"کچھ نہیں بھئی۔ جاؤ سوال نکالو ماسٹر صاحب آتے ہی ہوں گے"۔

صوفیہ نے ہولے ہولے کپڑوں کا انبار بستر پر لگا دیا لیکن اتنے سارے کپڑوں کے باوجود اس کے ماتھے کی لکیریں آپس میں جڑی ہوئی تھیں اور لبوں کے دونوں کونے لٹکے ہوئے تھے۔

ماتھے پر گرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے اس نے ایک ایک کپڑے کا بغور جائزہ لیا۔ نیلی قمیض اچھی تھی لیکن اس کے ساتھ کا دوپٹہ کل مٹی کالج اوڑھ کر لے گئی تھی تو اس کا کنارہ سائیکل کی چین نے چبا ڈالا —— گلابی سوٹ بہتر ثابت ہو سکتا تھا لیکن اب تو قمیصیں اس قدر لمبی ہو چکی تھیں کہ ٹخنوں کی خبر لاتی تھیں اور یہ گلابی قمیض دو سال پہلے کی سلوائی ہوئی تھی جب شلوار کی اپنی ایک منفرد حیثیت ہوا کرتی تھی —— اس نے سبز غرارہ اور قمیض نکال کر جائزہ لیا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ قمیض اس کے جسم کے خطوط پر ٹھیک بیٹھتی تھی۔ غرارہ چلتے میں یوں آواز دیتا جیسے کوچوان چابک جھٹک رہا ہو۔ گوٹ اچھی لگتی تھی۔ لمبائی ٹھیک تھی۔ گھیرا خوب تھا لیکن ایسے خوبصورت غرارے قمیض کے ساتھ سوتی جالی کا دوپٹہ تو یوں لگتا تھا جیسے پھولوں سے لدا پھندا دولہا سائیکل پہ جا رہا ہو —— اور باقی کپڑے تو سب کے سب صفر تھے۔ کم از کم صوفیہ کا یہی خیال تھا۔ اس نے اپنے جی میں سوچا، لال قمیض انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ سانولا رنگ اور لال قمیض گویا حبشی تربوز کھا رہا ہو —— اور سفید کپڑے بھی ناموزوں رہیں گے۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کوئی سمجھے کوا چونے میں چونچ نکالے بیٹھا ہے —— اور زرد رنگ تو وہ کسی قیمت پہ بھی پہننے کی جرأت نہیں

کرسکتی تھی۔ لگے گا سرسوں میں بھینس پھر رہی ہے۔

اس نے ناپسندیدگی سے اپنے کپڑوں پر جی ہی جی میں تبصرہ کیا اور پھر قلم کاغذ اٹھا کر اپنی سہیلی کو رقعہ لکھنے لگی:

یک دم کمرے میں ننھی پپو داخل ہوئی اور اس کی بانہہ پہ قاعدہ رکھتے ہوئے بولی:

'اور آپی دی "ع" سے عینک ہوتی ہے ناں؟'

'جی..... ہاں عینک ہی ہوتی ہے۔' وہ جلدی سے پیڈ پر قلم گھسیٹتی رہی۔

'پَر کیوں ہوتی ہے؟'

'ہوتی ہے پپو "ع" سے عینک اور "ق" سے قینچی! — یہ جانے کب سے ہوتی چلی آئی ہیں اور کب تک ہوتی چلی جائیں گی۔'

'پر کیوں کیوں کیوں دی؟'

'بس ایسے ہی ہوتا ہے پپو —'

صوفیہ نے زبان لفافے پر پھیرتے ہوئے کہا اور پھر پپو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی — 'دیکھ۔ یہ رقعہ لے اور نعیم کو ساتھ لے کر آپا افضل کے گھر جانا۔ سن رہی ہے نا۔ — آپا افضل کے گھر۔ وہاں سوڈا واٹر نہ پینے بیٹھ جانا۔ وہ تجھے کچھ کپڑے دیں گی....'

پپو نے یک دم ٹوک کر کہا۔ 'کپڑے آپی دی۔ پَر کیوں؟'

'بس دیں گی کپڑے۔ سنبھال کر سیدھی میرے پاس لانا — میں تجھے چیونگ گم دوں گی۔ سنا؟'

'کتنی چیونگ گم؟'

'ایک — !' صوفیہ بولی۔

'تین — !'

'نہیں دو —'

'دو کیوں؟ تین اچھاڑ —'

'اور مجھے کتنی چیونگ گم دو گی آپا؟ —' نعیم نے ساتھ والے کمرے سے نازل ہوتے ہوئے پوچھا۔

'دو —' صوفیہ بولی۔

'نہیں آپا، چار! —' نعیم منمنایا۔

'اچھا تین —'

'نہ آپا۔ پوری چار۔'

'جاؤ میں خط نہیں بھجواتی۔ منگتے کہیں کے!' صوفیہ نے چڑ کر جواب دیا۔

'اچھا مجھے چھوڑ دینا۔ میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں —' نعیم نے پپو سے خط چھینتے ہوئے کہا۔

'اوں ہوں! — خط پھٹ جائے گا۔ تمہیں گھر کا تو پتہ نہیں بھلا جاؤ گے کیسے؟' صوفیہ نے پوچھا۔

'پوچھ لوں گا جی۔ اس دن جو بڑی باجی نزہت کے گھر اکیلا ہی تو گیا تھا آپا؟' نعیم نے وثوق سے کہا۔

'کیوں تم داؤ دے؟ تم مجھے تین دے دینا میں دینب کو لے تر جاتی ہوں' — چھوٹی پپو خط کلیجے سے لگاتے ہوئے بولی۔

'اگر جاتے ہو تو اکٹھے جاؤ ورنہ میں خود چلی جاؤں گی۔' صوفیہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

اور جب پپو اور نعیم رخصت ہو گئے تو اس نے بغیر سنوارے سارے کپڑے ٹرنک میں ڈھیر کر دیے۔ لگتا تھا امریکی گونوں کا ٹھٹھ سے ابھی پٹڑیاں کٹی ہیں۔

پلنگ پر آف واٹ رنگ کی ساڑھی تازہ استری کر کے رکھی گئی۔ ساتھ ہی سلکی بلاؤز ہینگر پر ٹانگ گیا جیسے لاجونتی کا پودا ہو۔ شرمیلا سا۔ ہاتھ لگتے ہی چُرمُر ہو جانے والا —

ساڑھی اور بلاؤز کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی۔ گرم استری کے قرب سے جو پسینہ اس کے چہرے پر اکٹھا ہو گیا تھا، اس نے پونچھا اور پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر ان وسوسوں کو جی سے نکالنے لگی جو بزدل مصاحبوں کی طرح خلقِ الٰہی کو ڈرا رہے ہوں۔

ساتھ والے کمرے میں ابّا میاں نعیم کو بڑے زور و شور سے انگریزی پڑھا رہے تھے۔ ان کی گرجدار آواز بار بار صوفیہ کو سوچتے میں چونکا چونکا دیتی اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ کے رہ جاتا۔ ٹھنٹھناتے برتن کی سی آواز میں بڑے دھوم دھڑکے سے بار بار ہجّوں پر اصرار ہو رہا تھا اور بیچارہ نعیم منمنی سی آواز میں یوں الفاظ گنگناتا کہ ساری اے بی سی ایک سے ہو کر رہ جاتے۔

صوفیہ نے نیلا خط تکیے تلے سے نکالا۔ بڑے اہتمام سے اس کی تہ کھولی اور اپنی سہیلی کا وہ خط پھر پڑھنے لگی جسے وہ صبح سے قریباً ہر پندرہ منٹ کے بعد پڑھ چکی تھی۔ لکھا تھا:

'تم خواہ مخواہ نیاز سے ملتے ہوئے بدکتی ہو۔ ارے بھئی کچھ بھی تو نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں ___ واقعی! ___'

خط بند کر کے اس نے سر جھکا لیا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچنے لگی کہ سوچنے کے انداز بھی کتنے مختلف ہوتے ہیں اور ایک انسان کی پسند میں اور دوسرے کی پسند میں کیسے کڑے کوسوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ اسی یاسمین کا خط تھا جس نے نیاز کی شادی کے دن سارا وقت اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکنے میں گزار دیا تھا لیکن جب صوفیہ کے منہ کا تالا اس بکواس سے نہ کھل سکا تو یاسمین نے سیدھے سبھاؤ کہا تھا:

'ارے نیاز کی بھی کوئی بات ہے ___ ایسے شخص تو فیشن کی کتابوں میں ماڈل ہوا کرتے ہیں۔ صوفیہ! مرد ہو تو ایسا ہو ___ ایسا ہو کہ ڈوگ ٹک دے سکے۔ سمجھیں!"

یک لخت بارود میں چنگاری پڑی اور صوفیہ نے زانو پہ ٹکے ہوئے سر کو اٹھا کر پوچھا!

'کیا معنی؟'

'ارے! ڈوگ ٹک نہیں سمجھتیں؟ کبھی دیکھا نہیں جنگلی کتے کس طرح روند کو نکلا کرتے ہیں؟ ___ چاہے ڈبو میاں خارشی ہوں۔ ٹانگ میں لنگ ہو لیکن آنکھوں میں "آ آزما دیکھ" کی سی کیفیت ہوتی ہے لیکن تم کیا سمجھو گی ___ نہیں جی تمہیں تو شیو شدہ دھوئے دھائے بڑے خوش وضع قسم کے معزز آدمی پسند ہیں جن کا رنگ سفید اور ہونٹ لڑکیوں کی طرح نازک ہوتے ہیں ___ انہیں دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھنا پڑتا ہے کہ کہیں ہماری کسی حرکت سے ان کی پیشانی نہ بھیگ جائے ___ ارے چھوڑو ایسے لوگ کب ڈوگ ٹک دے سکتے ہیں؟'

'ڈوگ ٹک؟' اس نے پھر پوچھا۔

'سنو صوفیہ! میرا آدرشی مرد تو مجھے ہمیشہ سیڑھیاں اترتا نظر آتا ہے۔ لمبا تڑنگا ___ جس کی گالیں نہیں بلکہ ابھری ہوئی ہڈیاں ہیں۔ کھپانچے ایسے چہرے پر سرخی مائل سانولی کھال تنی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بڑے بڑے پیر بوٹوں میں گھدے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اترتا ہے بڑے طمطراق سے، بڑے عزم کے ساتھ ___ میں سیڑھیوں کے نیچے کھڑی یوں محسوس کرتی ہوں کہ ہر قدم اٹھتا ہے اور میرے قد سے چند انچ کاٹ کر علیحدہ کر دیتا ہے۔ اس کی ناک اور ہونٹوں کے ارد گرد کھائیوں ایسی لکیریں اور آنکھوں تلے کے حلقے اور بھی سیاہ ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اترتا ہے۔ اترتا چلا آتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے دو قدم رہ جاتی ہوں اور پھر بھی وہ رکتا نہیں ٹھہرتا نہیں۔ اسے میرے بالوں میں سجے ہوئے پھول اور جسم سے لپٹے ہوئے کپڑے نظر نہیں آتے ___ فقط چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں سکڑ جاتی ہیں اور آنکھوں میں ابوالہول کی سی بے نیازی جھلکنے لگتی ہے ___ اسے ڈوگ ٹک کہتے ہیں۔ جس طرح ڈبو میاں حریص

ہوتے ہیں اور پھر بھی ان کی جنگلی جبلت پکار پکار کر کہتی ہے دُور پرے ہو — بس ایسے ہی جبڑے سخت کر کے آنکھیں سکیڑتے ہوئے میرا آدرشی مرد مجھے دیکھتا ہے اور کہتا ہے دُور پرے ہو۔"

"اور تمہیں غصہ نہیں آتا؟" حیران ہو کر صوفیہ نے پوچھا تھا۔

"غصہ — ارے غصہ ایسا غصہ — میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں غصے سے کانپنے لگتی ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ ہاتھ میں لٹکایا ہوا پرس اس کے سر پہ دے ماروں لیکن وہ ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش سے مسکرا کر آگے نکل جاتا ہے۔ مجھے اس لمحے سمجھ نہیں آتی کہ اس کی آنکھوں کی حقارت اور لبوں کی ستائش کس ڈانڈے پر ملتی ہے۔ بس اس کے ہر قدم کے ساتھ میرا قد چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ میں حقیر سی مکھی اور وہ بڑا سا خونخوار شیر ہے۔ اگر میں نے اپنا پرس اس کے سر پہ مارا بھی تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے نکل جائے گا اور بس —"

"مجھے تو آدمی کی آنکھوں میں معصومیت کی طلب ہے۔" صوفیہ نے فیصلہ کُن انداز میں بات کی۔

"معصومیت؟ یعنی ناتجربہ کاری! ارے کیوں معصومیت کی بھینٹ چڑھنے لگی ہو۔ ایسا انسان تو چاہے کتنے ہی مظالم توڑے اسے بالآخر معاف کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی میری جان صدقِ دل سے — اور کہیں ڈوگ لگ دینے والا اگر دغا دے تو لطف ہی آجائے۔ ایک قسم کا تناؤ ہمیشہ باقی رہے گا کیونکہ اس کی ساری شخصیت تناؤ سے بنی ہے۔ ایسا تناؤ نہیں جو اُسے دیکھ کر میں محسوس کرتی ہوں بلکہ وہ کھینچے کی سی کیفیت جس سے اس زمین کے سارے عناصر آپس میں پیوست ہیں — اور تمہارے فیشن ٹیک کے ماڈل صاحب تو دوسرے دن ہی بھول بھال جائیں گے بالکل —"

صوفیہ نے سر جھکا لیا اور اپنے آپ سے بولی — "نہیں یاسمین! بھلا دینا کچھ ایسا

آسان بھی نہیں ہوتا جیسا تم سمجھتی ہو —"

چنک سے پاس والے کمرے میں بتی جلی اور منّی نے ریڈیو کے کان اس زور سے مروڑے کہ چند لمحے تو ابّا بھی ہچکے کرانا بھول گئے۔

فرمائشی پروگرام تو دیر ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ اب تو وہ ریکارڈ بھی سنائی دینے بند ہو گئے تھے جو پان والے کی دکان سے پکار بن کر اٹھ رہے تھے۔ ابا میاں کے کمرے کی بتی بجھ چکی تھی اور ان کے خراٹے بلند ہو رہے تھے۔ منّی کے کمرے میں ابھی تک روشنی تھی لیکن لگتا تھا کہ وہ اپنے ٹسٹ کے لیے پڑھتی پڑھتی کتاب پہ جھکی سو چکی ہے۔ سارے گھر پر خاموشی طاری تھی، صرف باورچی خانے میں نلکہ چل رہا تھا اور برتن گھسٹنے اور مانجھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

صوفیہ کئی گھنٹے دائیں گال پر ہاتھ رکھ کر سوچتی رہی تھی۔ سامنے دیوار پہ نگاہیں گاڑے گاڑے اب اس کی آنکھوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے رخسار سے چپکی ہوئی ہتھیلی اٹھائی تو گال میں عین آنکھ کے نیچے ٹیس سی اٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈریسنگ ٹیبل سے کریم کی شیشی اٹھائی اور ہولے ہولے اس سرخ حصے پر تھوڑی سی کریم ملنے لگی۔ پھر اس نے دوپٹے کے کونے سے ہاتھ پونچھ کر از سرِ نو لفافہ کھولا اور اس تحریر پہ نظریں گاڑ دیں جو بغیر پڑھے ہی اس کے ذہن میں اپنا آپ دہراتی چلی جا رہی تھی — یاسمین پہ ایمان لاتے ہوئے اس نے اس کے الفاظ پڑھے:

"تم نے نیاز کی بیوی نہیں دیکھی — ارے چھوڑو صوفیہ! — تمہارے بعد اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے گرم گرم چائے کی پیالی کے بعد خنک حلق میں انڈیلنا پڑے — بخدا تم نیاز سے ضرور ملو۔ ملنے والی بات ہی ہے۔ میری تمنا نہیں استدعا ہے۔ جانتی ہو یوں چھپ کر بیٹھ رہنے سے وہ کیا سمجھے گا؟ یہی کہ تم ہمارے رنج کے اندر ہی اندر گھلی مرتی ہو اور مارے شرم کے کسی کو

منہ نہیں دکھاتیں۔ سنو صوفیہ! نیاز سے ملنا ناگزیر ہے۔ پرسوں ہمارے ہاں اس جوڑے کا نزول ہو رہا ہے۔ تم یوں بن سنور کر آؤ کہ ایک بار تو نیاز بھی کلیجہ مسوس کر رہ جائے —— اور کچھ نہیں تو تم پچھتاوا بن کر ہی اس کے وجود سے چمٹ جاؤ۔ توبہ توبہ! یہ چھپ کر زندگی بسر کرنا تو انتہائی بزدلی ہے۔"

صوفیہ نے اپنے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر چہرہ ان میں لے لیا اور ماتھے پر بے شمار بل ڈال کر سوچنے لگی، آخر یاسمین ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو نیاز کے جی میں ہلکی سی کسک بن کر ایک بار پھر اٹھنا چاہیے —— وہ سال بھر کے وقفے میں کتنی بدل گئی تھی یہی نیاز تھا جس کے لیے وہ کبھی خیال میں بھی دکھ کا تصور کرنا نہ جانتی تھی اور یہی نیاز تھا، جس کے وجود کے ساتھ وہ گھن بن کر لپٹ جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ سارے وعدے جو نیاز کے لبوں سے سرگوشیاں بن کر نکلے اس کے ذہن میں اب تک ہتھوڑے چلا رہے تھے۔ وہ ننھی منی شرارتیں اس کے لہو میں تحلیل ہو کر ابھی تک حرکت کرتی تھیں جو شرارتیں ہی تھیں فقط شرارتیں! —— اور وہ مبہم سی گرہ یہ گی جو نیاز کینچلی کی طرح کب کا اتار چکا تھا۔ ابھی تک اس کی زیست کا حاصل تھی۔ وہ ساری باتیں اب قند و نبات نہ رہی تھیں بلکہ ان میں اب پچھتاوے، شرمندگی اور وسوسوں کا زہر مل گیا تھا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ان باتوں کا کسیلا پن اس کی زندگی میں کڑوے دھوئیں کی طرح بل کھا رہا تھا ایسا دھواں جسے نکلنے کی راہ نہ ملے اور یہ سب کچھ برداشت کر لیا جاتا، سب کچھ سہہ لیا جاتا اگر صبح و شام صوفیہ کو یہ خیال نہ ستاتا کہ نیاز کی شادی اس کی اپنی پسند کی شادی تھی، اس میں اس کے ماں باپ کا دباؤ قطعی شامل نہ تھا۔

یاسمین کے خط کو پڑھ کر اسے بڑا حوصلہ ہوا اور وہ درد بھی بھول گیا جو دائیں گال میں رہ رہ کر کروٹیں لیتا تھا۔ اس نے نیاز کی بیوی سے متعلق جملہ بار بار پڑھا اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس نے ساڑھی اٹھا کر اپنے چہرے کے ساتھ لگائی۔ بلاؤز کو

جانچا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر قمیص اتارنے لگی —— اسے ریہرسل کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔

قدِ آدم آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر تو وہ متحیر رہ گئی۔ ساڑھی کی سلوٹیں اس کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ پتلی سی تنگ کمر بلاؤز میں اور بھی گھٹ کر رہ گئی تھی اور بھرے بھرے کندھے نمایاں نظر آنے لگے تھے۔

اپنی شبیہ دیکھ کر اسے بھول گیا کہ ناک آگے سے پھیلی ہوئی ہے کیونکہ لپ سٹک کا رنگ ہی ایسا تھا کہ ناک پر نظر ہی نہ جمتی تھی اور گلے میں پڑی ہوئی کنٹھی ایسی تھی کہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ کندھے سر کے بہت قریب ہیں۔ گھنیرے بال سنوار کر جوڑے کی شکل میں اس کی گردن پر کنڈلی مارے بیٹھے تھے اور آنکھوں میں چمک تھی گویا وہ آگ کے سامنے بیٹھی بڑی پُراسرار کہانی سُنا رہی ہو۔

صوفیہ نے ایک لمبی سانس لی اور اپنے جلتے رخساروں پر ہتھیلیاں جما لیں۔ دائیں گال میں ٹیس سی اٹھی لیکن اس نے بڑی لا پروائی سے کہا:

"نہیں یاسمین! میں ضرور آؤں گی۔ مجھے بزدل نہ سمجھو —— میں اس بار ضرور آؤں گی اور جب نیاز آگے بڑھے گا تو میں سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کی طرف ضرور دیکھوں گی۔ ایک ایسی نظر سے جس میں جنم جنم کی پھٹکار ہوگی ——"

ایسے ہی خیالوں میں الجھی ہوئی وہ رات دیر سے سوئی۔ صبح اس وقت آنکھ کھلی جب سورج کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔ منی بغیر اس سے پوچھے اس کا دوپٹہ اوڑھ کر کالج جا چکی تھی۔ نعیم پپو کو سائیکل پہ بٹھا بچوں کے سکول کو روانہ ہو چکا تھا اور ابا میاں ڈیڑھ گھنٹہ اپنی چھڑی ڈھونڈنے کے بعد خالی ہاتھ کچہری چلے گئے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی لیکن آنگن میں جھاڑو دینے کی آواز آ رہی تھی۔

صوفیہ نے بڑی لمبی سی انگڑائی لی اور سامنے ٹنگی ہوئی ساڑھی کو دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا! در اٹھتے ہی آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ رات والی کریم کی چکناہٹ ابھی تک چہرے پر موجود تھی لیکن غور سے دیکھنے پر اسے احساس ہوا کہ دائیں گال زیادہ سرخ تھی اور عین آنکھ کے نیچے یہ سرخی دھبہ بن چکی تھی۔ اس نے انگلی سے اس چٹاخ کو برابر کرنا چاہا لیکن انگلی کے دباؤ سے رخسار میں ایسا درد اٹھا کہ اس نے دبانا چھوڑ دیا اور منہ دھونے کے لیے غسل خانے کی طرف چل دی۔

منہ دھونے کے بعد جب اس نے دوبارہ دیکھا تو سرخی بڑھ رہی تھی اور ناک کی دیوار اور گال کی اترائی کے درمیان ایک پھنسی کا ابھرتا ہوا سر نظر آ رہا تھا۔ صوفیہ نے جلدی سے اس حصے پر کریم ملی اور دعا کرنے لگی کہ پھنسی شام ہونے سے پہلے پہلے دب جائے۔

چار بج چکے تھے۔ صوفیہ آف وائٹ ساڑھی پہنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ کپڑے ویسے ہی چپٹے ہوئے اس کے جسم کی خوبیاں اجاگر کر رہے تھے لیکن صوفیہ کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور وہ بار بار آئینے میں چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے میں پڑھنے والوں نے پھر اپنی پڑھائی شروع کر دی تھی۔ منّی فارسی رٹتے جا رہی تھی اور نعیم سر کو پنسل سے کھجلاتا ہوا فارمولوں کے حل سوچ رہا تھا۔ پھر منّی نے پڑھتے پڑھتے یکدم پکارا:

"آپا اب جا بھی چکو۔ کب کا تانگہ کھڑا ہے۔"

صوفیہ آئینے پر جھک گئی۔ دائیں گال تمتما رہی تھی اور آنکھ تلے ناک کی اٹھان تک ایک زرد رو بد ہیئت پھنسی نے یوں سر نکال لیا تھا جیسے کچی بھنڈی کا بیج چپک کر رہ گیا ہو۔ مارے کرب کے اب اس کی سرخ آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں اور دایاں رخسار کچھ یوں درد سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا کہ اس کے لب کے کونے مسکراتے سے نظر آتے تھے۔ اس نے تنگ نظروں سے شیشے میں اس ڈوگ ٹک کو دیکھا اور پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا،

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آپا — آپا —" پپّو نے کمرے میں وارد ہوتے ہوئے کہا۔

لیکن صوفیہ نے ہاتھ چہرے سے نہ اٹھائے۔

"یاسمین آپا کا فون آیا ہے جلدی آؤ —"

صوفیہ نے گھٹی گھٹی آواز میں منّی کو آواز دی۔ "منّی! یاسمین کو فون کر دو میرا سر درد کر رہا ہے میں نہیں آ سکتی۔"

"آپی — آپی دی روتیوں رہی ہو —" پپّو نے پوچھا۔

ساتھ والے کمرے میں سے منّی بولی: "آپا تم آپی فون کر دو میں پڑھ رہی ہوں اور باجی یاسمین بڑی لمبی باتیں کرنے لگتی ہیں۔"

پھر آموختہ رٹتی ہوئی اس کی آواز آئی:

"ہنوز چشمش نگران است کہ ملک یا دگران است۔ . . ."

صوفیہ نے ساڑھی کے پلو میں منہ چھپا لیا۔ رات کا سارا حوصلہ آنسوؤں میں بہ رہا تھا اور منّی کی آواز اسے یوں جھنجھوڑ رہی تھی جیسے رات کے اندھیرے میں شکستہ مقبرے کے موکھے سے کوئی کبوتر گر کر مرقد پہ پھڑ پھڑانے لگے۔

—

پپیا نام کا دیا

نہ جانے کب سے قیصر کی بنیادوں میں پانی پڑ رہا تھا۔ دیکھنے میں تو وہ بڑا تنومند درخت نظر آتا تھا لیکن اندر سے مٹی پولی ہو گئی تھی اور کھوکھلی جڑوں کا مرکزِ ثقل بگڑ چکا تھا۔ درخت بظاہر سرو قد تھا پر شہنیوں کو اندر ہی اندر یہ پیام مل گیا تھا کہ کسی لمحے بھی درخت کا تنا تیورا کر نئی کونپلوں سمیت زمین پر گر سکتا ہے۔

پپیا کچھ ایسی غزال چشم نہ تھی۔ دراز قد بھی نظر نہ آتی۔ رنگت بھی عنابی شہابی نہ تھی لیکن برسن ہار بادلوں کی طرح اس کا وجود بڑے وعدوں کے ساتھ بھرا ہوا تھا ——— وہ کب برسے گی؟ ——— مینہ مسلسل ہوگا کہ کن من کن من جھڑی لگے گی ——— خشک سالی سے چٹخے ہوئے بنجر علاقے پر شیتل پھوار بن کر گرے گی کہ ٹھہرے تالاب پر ان گنت بھنوروں کی شکل میں جذب ہو جائے گی؟

جس روز پہلی بار قیصر کے دل کو کھینچ لگی وہ ایک فیشن ایبل بیکری میں کھڑا تھا۔ سامان وہ زیادہ بندھا چکا تھا اور پیسے اس کی ماما نے کم دیے تھے ——— کیک پیسٹری کے ڈبوں پر نظر ڈال کر جب رازداری سے وہ اپنے بٹوے کے پرت کھولنے لگا تو اس وقت پپیا شیشے کا وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی جس کی باہر والی طرف "پش"

لکھا تھا۔

اچانک کھڑکی کھل جانے پر ہوا کے جھونکے سے جیسے منہ سے ایک آہ سی نکلتی ہے ایسے ہی قیصر کے ہونٹوں سے بڑی ہلکی بڑی نامعلوم سی سیٹی نذرانے کے طور پر نکلی۔

پپیا کے لیے قیصر بجلی کا ایک کھمبا تھا جس میں اچانک شام ڈھلے بتی جل گئی تھی۔

وہ لاپرواہی سے آگے بڑھی۔ کاؤنٹر پر ایک کہنی ٹکا کر اپنا چہرہ ہاتھ کے پیالے میں دھرا۔ ایک پاؤں زمین پر جمایا اور دوسرے پاؤں کے پنجے کو پیچھے کھڑا کر کے ہلاتی ہوئی بولی:

"کریم پف ہیں؟"

"جی ——— کس قدر؟"

"کوارٹر پاؤنڈ ———"

قیصر پانچ پانچ دس دس روپے کے نوٹ اور ریزگاری جمع کرتا رہا۔ پھر اس نے بلیک فورسٹ کیک واپس کر دیا کیونکہ سامان اس نے زیادہ پیک کروا لیا تھا اور پیسے ماما نے کم دیے تھے۔

اس ساری کارروائی کے دوران وہ نیم جھکی مندی مندی سی آنکھوں سے پپیا کو دیکھتا رہا۔ پپیا نے شاکنگ پنک رنگ کا لبادہ نما کچھ قمیض کچھ فراک کچھ سکرٹ سا پہن رکھا تھا۔ لمبی ہیل والی کالی کورٹ شوز کے اندر شاکنگ پنک جرابوں میں دھاگے اکھڑ جانے کی وجہ سے لمبی ادھڑن بن گئی تھی ——— کندھوں پر دوپٹہ نہ تھا۔ مہندی رنگے سیاہ بالوں میں انگارہ سی چمک البتہ ضرور تھی۔

جب پپیا کریم پف لے کر اور قیصر چار ڈبے اٹھائے بیکری سے نکلے تو قیصر نے پش والا دروازہ کھولا۔ پپیا کے گزرنے کا انتظار کیا۔ پپیا نے مسکرا کر تھینک یو کہا اور سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی اپنی کار میں سوار ہو کر گاڑیاں بیک کرنے لگے،

کیونکہ سامنے سڑک کے عین وسط میں کوئی حرصاحرصی کا مارا اپنی سفید گاڑی پارک کر گیا تھا۔ کار ریک کرتے ہوئے قیصر نے پپا کی گاڑی کا ماڈل، کار کا نمبر اور گردن مڑی زاویۂ لوٹ ڈالی کو دیکھا۔ مین سڑک پر پہنچتے پہنچتے سٹیرنگ کو پھیرنے والے قیصر کے ہاتھ بھیگ چکے تھے۔ ونڈ سکرین کے سامنے لگے ہوئے شیشے میں اب پپا کی کار نظر نہ آتی تھی کیونکہ وہ پچھلے موڑ پر ہی مڑ گئی تھی۔ اب ان گنت کاروں کے باوجود قیصر کو سڑک خالی نظر آئی۔

دل ہی دل میں قیصر نے سوچا، ان لڑکیوں میں جانے خدا نے کیا خوبی رکھی ہے جب بھی یہ چاہیں، موسم بدل سکتی ہیں۔ سردیوں میں لُو چلنے لگے اور گرمیوں میں برف خانے جیسی سردی محسوس ہو۔ اندھیری رات جگمگا اٹھے اور پورن ماشی کی رات اندھی ہو جائے۔ وہ کار چلاتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اس کمزور جنس کو بنانے والے نے بڑا ہی طاقت ور بنایا تھا۔ دور بیٹھی عورت مرد کو ایسے کھینچ سکتی ہے جیسے لوہے چون کو مقناطیس — کچھ اپنے آپ سے ناخوش اور کچھ اوپر والے سے گلہ گزار وہ گھر میں داخل ہوا۔

"اتنی دیر لگا دیتے ہیں لکو! — کچھ خیال نہیں ہے تمہیں اے لیول امتحان ایسے تو نہیں دے دو گے۔ سب تمہاری شکایت کرتے ہیں — بڑا ٹائم ویسٹ کرنا آتا ہے تمہیں؟"

پیسٹری پیٹیز کے ڈبے اس نے خاموشی سے ماما کو پکڑا دیے۔ جب سے وہ شیو کرنے لگا تھا اس کے تعلقات ماما سے اکھڑ گئے تھے۔ کبھی دوستوں کے سامنے ماما مٹھار مٹھار کر باتیں کرنے لگتی — کبھی پانچ دس مہمانوں کے سامنے شیم شیم والی گفتگو کے ساتھ اس کا دل چھلنی کر دیتی۔ جب وہ دل لگا کر پڑھتا تب بہت جھڑکیاں پڑتیں۔ جب پڑھنا چھوڑ کر سکوائش کھیلنا شروع کر دیتا تو ماما پوری دلداریوں کے ساتھ اسے اپنے آپ سے باندھ لیتی۔ اس جھک جھکوری کی لمبی داستانیں ابو تک پہنچیں۔ ماما گھنٹوں اپنی سہیلیوں

کے ساتھ لکو کو ڈسکس کرتی۔ روتی، قسمیں کھاتی، اپنے بال نوچتی — ماما کو کہیں اندر یقین ہو چکا تھا کہ اس کا لکو نالائق ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح کبھی زندگی بنا نہیں سکتا اور جو اونچا مارگٹ ماما نے قیصر کے لیے دل میں سوچ رکھا تھا اس تک پہنچ نہیں سکتا۔

پپا کو بیکری کی دکان پر دیکھنے کے بعد قیصر اپنے وجود کی جھڑن کے ساتھ گھر میں داخل ہوا کیونکہ سارا وجود تو وہ پپا کو نذرانہ دے آیا تھا۔ شاید یہ خبط آدھے گھنٹے کے بعد وی سی آر پر کوئی فلم دیکھتے ہوئے ختم ہو جاتا لیکن کبھی کبھی واقعات خود ہی سنگین شکل اختیار کر لیتے ہیں — وہ مضمحل سا ننگے پاؤں قالین پہ پھر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ماما کی آواز تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کارڈلیس اٹھایا تو اس پہ دو سہیلیاں آپس میں گفتگو کر رہی تھیں۔ پپا کہہ رہی تھی:

"تمہیں پتہ ہے آنٹی میرے لیے شاکنگ پنک سٹاکنگز لائی تھیں — ایک تو سلی آج ہی پھٹ بھی گیا میں نے بیکری میں نوٹ کیا تھا — ہاں ہاں گئی تھی — کریم پف لینے —"

ان دونوں لڑکیوں کی کراس ٹاک پر اگر قیصر گزارہ کر لیتا تو شاید عافیت گزرتی لیکن وہ تو بیچ میں کود پڑا، اور آگ جس کو وہ سمجھتا تھا کہ سرد پڑ جائے گی اور بھڑکی۔ اب پپا اور وہ ٹیلی فونی دوست بن گئے۔ پہلے پہل تو پپا کی طرف سے فون آنے لگا۔ وہ بڑی منتوں سماجتوں سے نمبر پوچھتا لیکن کج رفتار نے کبھی اپنا نمبر نہ بتایا ہمیشہ یہی کہتی۔ بھئی میں خود فون کروں گی۔

ان دنوں سارا وقت قیصر کا دل فون کی گھنٹی کے ساتھ بندھا رہتا۔ کہاں تو گھنٹی بجتی رہتی لیکن وہ قریب نہ پھٹکتا اور ماما غسلخانے سے چلاتیں — "بھئی لکو! فون کیوں نہیں دیکھتے —" وہ پھر بھی فون کی طرف نہ بڑھتا اور اب کارڈلیس ہی اس کے کمرے میں رہنے لگا۔ حتیٰ کہ نہاتے وقت بھی فون اس کے ساتھ جاتا۔ اس کی ... ش ہوتی کہ پپا رات کو فون

کرے لیکن پیا کہتی:

"نکو! میں رات کو کیسے فون کر سکتی ہوں۔ امی مجھے جان سے مار ڈالیں گی۔"

"اچھا رات کو ایک بجے ــــ تمہیں پتہ ہے میرے پاس ایک دیا ہے۔ میں نے اس کا نام پیا رکھا ہے۔ میں رات کو پورے ایک بجے اسے ٹیلی فون کے پاس رکھ کر جلاتا ہوں۔ جب تک وہ جلتا ہے میں جیتا رہتا ہوں ــــ جب وہ بجھنے لگتا ہے تو میں انتظار نہیں کرتا صرف جینا بند کر دیتا ہوں۔"

"ہائے نہیں۔ میں باجی کے کمرے میں سوتی ہوں ــــ میں رات کو فون نہیں کر سکتی ــــ"

"چلو آج رات ــــ صرف ایک بار ــــ"

ہوتے ہوتے رات کے پچھلے پہر لمبے لمبے فون ہونے لگے۔ آواز دونوں کی پیاسی تھی اور دونوں یہی چاہتے تھے کہ تعریف اس آواز کی ہوتی رہے۔ ہولے ہولے ان فون کالز کی بدولت وہ ایک دوسرے کے یوں واقف بن گئے جیسے مدتوں ساتھ رہے ہوں۔ نہ تو پیا کا ارادہ قیصر سے ملنے کا تھا اور نہ شدید خواہش کے باوجود قیصر پیا کو ملاقاتوں پر مجبور کرنا چاہتا تھا۔

اپر کلاس کے نوجوانوں کی طرح قیصر میں بھی ڈنک نہیں تھا۔ وہ سانپ، بچھو، بِھڑ یا سب کچھ تھا لیکن اس میں کاٹنے، خونخیانے، دھول دھپا مارنے کی صلاحیت نہ تھی۔ انگریزی زبان اور [illegible] نے اس کی بول چال میں ایک لاچاری سی پیدا کر دی تھی۔ ماما کے ساتھ صبح شام لاجواب کر دینے والی بحثوں نے اس میں گیلی لکڑی کا سلگاؤ پیدا کر دیا تھا جس قدر اسے پیول کی پڑھائی جان لیوا تھی اسی قدر وہ اپنے آپ کو اس محنت کا نااہل پاتا تھا وہ اندر ہی اندر کہیں شاعر تھا۔ عاشق تھا۔ ناکام انسان تھا۔ وہ اپنی ماں کی آرزوؤں کو سمجھتا ضرور تھا لیکن دنیاوی طور پر کامیاب ہونے کی اس میں صلاحیت نہ تھی۔ اکلوتا ہونے کی وجہ

سے وہ ماما کا کمر تکیہ تھا اور جانتا تھا کہ اگر دنیاوی ترقی کے اس زینے پہ نہ پہنچ سکا تو ماما کھڑی کھلوتی مر جائے گی لیکن گلے پڑے کا سودا وہ کر نہ سکتا تھا۔ اسی لیے اب وہ پڑھنے بیٹھتا تو کاپیوں پر خوبصورت کٹے بالوں والی لڑکیوں کی تصویریں بناتا رہتا تھا جنھوں نے شاکنگ پنک شاکنگ پن رکھی ہوتی تھیں۔ یہ تصویریں گونگی تھیں لیکن قیصر ان کی زبان سمجھتا اور بولتا تھا۔ کھڑکی میں کھڑے کھڑے ہوائی جہازوں کو دیکھنے کے بہانے وہ ایک آواز کے گرد بڑے بڑے خواب بُنتا رہتا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی اور آنکھوں میں خمار اتر آتا

یہی دن تھے جب وہ خود کلامی کا شکار رہا ــــ

ہر وقت اس کے اندر بیٹھی ہوئی شاکنگ پنک لڑکی باتیں کرتی رہتی۔ وہ تار توڑ دیتا تو پھر فون کی گھنٹی بجنے لگتی اور وہ تمام سوال ازسرِنو پوچھے جاتے جن کا جواب دونوں جانب ازبر ہو چکا تھا۔

لیکن پیا کی احتیاط اور قیصر کی شرافت کے باوجود وہ دونوں ایک دن بھرے بازار مل گئے۔ پیا آئس کریم کے انتظار میں تھی اور قیصر ماما کے لیے کچھ دوائیں خرید کر دکان سے باہر نکل رہا تھا۔

پہلی ہی نظر میں دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اپنی اپنی تربیت کی وجہ سے انھوں نے اس حادثے کو معمولی ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن اندر ہی اندر قیصر کو لگا جیسے جشنِ تاجپوشی میں اسے تخت پر بٹھایا جا رہا ہے ــــ پیا بلش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ قیصر ہکلانے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس لیے پیا منہ پرے کر کے کون کھاتی رہی اور قیصر دکانوں کے بورڈ پڑھتا ہوا موسم کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ دونوں کے قدم گلبرگ کے اس بازار میں مینخے گئے ــــ پیا دل میں حیران تھی کہ وہ جسے معمولی ٹیلی فون دوستی سمجھتی رہی وہ تو ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج وہ نہیں جانتی ــــ قیصر سوچ رہا تھا کہ لڑکیوں

کے قدم لینے میں جو ذلت وہ سمجھا کرتا تھا ذلت کا وہی احساس تو اصل زندگی ہے۔

سپاہی ان گنت بار ٹریفک کے اشارے بدل چکا تھا لیکن وہ اپنی اپنی کار کی چابیاں ہاتھ میں لیے وہیں کھڑے تھے۔

قیصر نے کنکھیوں سے پیا کی جانب دیکھ کر سوچا کہ شکل تو اس لڑکی کی بڑی معمولی ہے تھریڈنگ کی وجہ سے جلد بھی خراب ہو چکی ہے۔ پھر میں یہاں کیوں اس ظالم مظلوم نما کے حضور کھڑا ہوں — پیا سوچ رہی تھی کہ اگر ابھی کالج کی کوئی دوست آ گئی اور مجھے قیصر کا تعارف کرانا پڑا تو کیا بات سیف رہ سکے گی؟

ان دونوں نے اپنے اپنے راستے جانے کی کوشش کی۔ وہ ایک کار میں ایک سمت پر تو جا سکتے تھے لیکن بالکل مختلف سمتوں کا سفر ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ پھر پتہ نہیں کونسی قوت تھی۔ کیسی ہلا شیری تھی۔ ایک دوسرے کے قرب کی کیسی پیاس تھی جو ان دونوں کو ریسٹورنٹ کے اندر لے گئی۔

آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتے بڑا وقت گزر گیا۔ نہ ان دونوں میں سے کسی نے سامنے دھرے کوک کو ہاتھ لگایا نہ برگر کھایا اور روانیوں میں سے بچے پیسے کاؤنٹر پر ادا کر کے قیصر گھر آ گیا۔

کہتے ہیں۔ پہلے پہل سیلاب محض انگلی بھر سوراخ کرتا ہے پھر سیسہ پلائی دیوار بھی کام نہیں آتی۔ اگر کسی طرح یہ ملاقات ہی نہ ہوتی تو شاید کچھ بچ بچاؤ ہو جاتا لیکن اب بھوسے میں تیل ڈال کر جلتی تیلی دکھائی جا چکی تھی۔ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ قیصر پرائیویٹ طور پر اے لیول کا امتحان دے رہا تھا۔ پیا تھرڈ ایئر میں تھی۔ وہ اکیلا ٹیوشن پڑھنے جاتا تھا۔ پیا تنہا کالج کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ کچھ لوگ شاید یہ سمجھیں کہ اگر وہ دونوں تنہا باہر نہ نکلتے تو شاید معاملہ کچھ اور ہوتا۔ ان دونوں کو اگر ملنے ملانے نہ بھی دیا جاتا تو بھی دونوں طرف تراہ تراہ ہوتی رہتی۔

ماما بھی آخر ایک منصوبہ رکھتی تھی۔ اسے بھی اپنے واحد گر تکیے کو کسی اونچی منزل پہ پہنچانا تھا۔ ایک روز ٹیوشن پر جاتے ہوئے قیصر کو ماما نے پکڑ لیا۔

"ککو ٹھہرو —"

"جی ماما —"

"مجھے جو بتاؤ گے سچ بتانا —"

"جی ماما —"

"تم سید آصف علی کی بیٹی سے ملتے رہے ہو — میری اجازت کے بغیر؟"

کسی نے قیصر پر ترپال ڈال کر اس پر رسی باندھ دی — اس کا دم گھٹنے لگا۔

"تمہیں پتہ ہے ان کا اسٹیٹس کیا ہے؟ — تمہیں معلوم ہے تمہارے جیسے لڑکوں کو ان کا باپ چپراسی بھی نہ رکھے —"

پہلی بار اس کے کانوں میں اپنی اسیری کی اصلی حالت کھلی —

"ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے اگر وہ لوگ مان جائیں — لیکن ان لوگوں کو منانے کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔ بننا پڑے گا۔ تمہارا خیال ہے ایک اے لیول کی تیاری کرنیوالے لڑکے سے وہ اپنی بیٹی بیاہ دیں گے؟ — تم عام زندگی میں ایک بڑے افسر کے بیٹے ہو لیکن ککو! وہ لینڈ لارڈ ہیں — کارخانے دار ہیں — کس مصیبت میں پھنس گئے ہو تم توجہ سے پڑھائی کرو —"

قیصر نے جواب دینا چاہا۔ کچھ اپنی صفائی میں کچھ پیا کی سچائی میں لیکن اس وقت ماما نے کونے میں پڑا ہوا ریکٹ اتنی زور سے صوفے کے بازو پہ مارا کہ ریکٹ کے عین درمیان میں پٹاخے کی آواز آئی اور جال والا حصہ لٹک گیا۔

"تمہیں کیا پتہ امیرزادیوں کے پاس تمہارے جیسے کھلونے بہت — ماری تو میں جاؤں گی جس کا ایک ہی بیٹا ہے — ماری تو میں جاؤں گی قیصر —"

ماما سر کے بال نوچتی، حلق سے اونٹ جیسی آوازیں نکالتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

پہلی بار اس کی محبت کے شگوفے نے دنیا کی ہوا چکھی۔ اب تک وہ اندر کہیں کسی اندھیرے میں منی پلانٹ کی طرح پل رہا تھا۔ اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پیا کو پانے تک لمبی مسافت کیسے طے ہوگی جبکہ پڑھائی کا سفر وہ طے ہی نہیں کر سکتا۔ وہ تو سارا دن پیا کے ناخنوں، اس کے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ کان کی لو پر بیٹھے ہوئے ٹوپس اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتے ——— ہنستے سمے سامنے والے دونوں دانتوں کے بیچ کے شگاف میں سے جو خوش دلی مسکراتی ہے وہی اس کے تعاقب میں صبح و شام رہتی تھی یہ نہیں کہ وہ ٹیوشن پڑھنے نہیں جاتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ پہروں دروازہ بند کر کے کتابیں کھولے حروف کی چیونٹیاں نہیں دیکھتا تھا۔ پر کچھ لوگ اندر ہی اندر عاشق ہوتے ہیں۔ کیفیتوں میں رہتے ہیں ——— دنیا کے اعتبار سے ناکام انسان ہوتے ہیں۔ جس روز ماما نے سکواش کا ریکٹ توڑ کر اپنے سر کے بال نوچے، اس دن کے بعد سے قیصر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ پیا سے ملنے پر پڑھائی کو ترجیح دینے لگا۔ اس نے ٹیلی فون کی گھنٹی بھی سننے سے کئی بار دل میں انکار کیا ——— لیکن اندر اتنی چومکھی لڑائی لڑنے کے باوجود جو چیز اسے کاٹ رہی تھی وہ یہی تھی کہ آخر اس محبت میں جلنے، بھسم ہونے کا فائدہ؟ ——— وہ بھلا سید آصف علی کی بیٹی کو کیا دے سکتا ہے؟ ——— محبت کا منی پلانٹ دنیا کی دھوپ کب تک برداشت کر سکتا ہے؟ وہ عجیب مخمصے میں پھنسا رہتا ——— دل پر محبت کی بالادستی تھی۔ پڑھائی پہ ماما کا راج چلتا تھا۔ باپ سے وہ یونہی پیار کرنے کا عادی نہ تھا۔ کبھی آٹھ آٹھ گھنٹے پڑھتا رہتا کبھی تین تین دن کتاب کو ہاتھ نہ لگاتا۔ ہر بار نیا ٹائم ٹیبل بنتا، نئی قسمیں کھائی جاتیں لیکن پروگرام پہ عمل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ان ہی دنوں جب وہ اپنے سوا نویں پیا نامی براؤن لڑکی کو بھلا چکا تھا، وہ اسے اچانک فائن وڈیو شاپ میں مل گئی۔ پیا کاؤنٹر پہ کھڑی کہنی رکھے، ہاتھ کے پیالے میں چہرہ

جمائے، ایک پاؤں فرش پر جما کر دوسرا پیر پنجے پہ اٹھائے کھڑی تھی جب قیصر کچھ فلمیں واپس کرنے وڈیو شاپ میں داخل ہوا۔

"ہائے تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ ——— " پیا نے سارے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"میں ——— ؟ کچھ نہیں ——— "

"میں تمہارے جیسے لڑکے کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں ——— "

اس کے بعد قیصر اسے کہنی سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دکان کے باہر لے گیا۔ وہ دونوں پیا کی کار کے پاس پہنچے۔ پیا نے کئی بار کار سٹارٹ کی لیکن قیصر نے کار میں سے اترنے سے انکار کر دیا۔ قیصر نے بہت منتیں کر کے پیا کو منانے کی کوشش کی لیکن پیا نے مَن جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی ——— جب دونوں طرف سے بہت گرمی سردی ہو گئی تو آخر پیا نے کہا:

"چلو گھر چلو ——— ایک بار یہ ٹنٹا بھی ختم ہو کسی طرح تم شکل دکھا آؤ باقی سب میں سنبھال لوں گی ——— "

قیصر کے غبارے میں سے ساری گیس نکل گئی۔ وہ کار میں سے نکل کر ڈرائیور والے دروازے کی طرف آ گیا اور دونوں ہاتھ پیا کے کندھوں پر رکھ کر بولا:

"نہیں پیا ——— میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا ——— سوری!"

"کیوں ——— ؟"

"ماما میرے ابو بہت بڑے سرکاری افسر ہیں ——— لیکن ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ بنگلہ سرکاری ہے۔ کار سرکاری ہے ——— اور میں ابھی اے لیول کا امتحان بھی نہیں دے پایا ——— "

"میں انتظار کر لوں گی قیصر ——— "

"کتنا انتظار ——— کتنے سال ——— کب تک؟ ——— "

"جب تک تم کہو ——— "

پیا کے ہونٹوں پر آنسوؤں کی آمد کے آثار تھے۔

"میری ماں مجھے کچھ بنانا چاہتی ہے ـــ میں کچھ بن نہیں سکتا پیا ـــ"

"چلو میں گزارہ کر لوں گی کٹو ـــ"

"گزارہ کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا پیا ـــ اور پھر میں کیوں تمہیں وہ تکلیفیں دوں جن کا ابھی تمہیں ٹھیک سے علم بھی نہیں ہے"

"اور کچھ نہ ہوا کٹو تو ہم زمینوں پر چلے جائیں گے کٹو ـــ میری زمین ہم دونوں کے لیے کافی ہے ـــ"

"نہیں پیا ـــ میں امی کے سوا کسی سے پاکٹ منی نہیں لے سکتا ـــ"

"تمہیں معلوم ہے کہ امی میری شادی کر دیں گی؟ ـــ تم میرے ساتھ چلو ـــ باقی میں سنبھال لوں گی قیصر ـــ سب میری زبان سے ڈرتے ہیں ـــ تم چلو تو سہی ـــ سب جانتے ہیں جو میں چاہتی ہوں کر کے رہتی ہوں ـــ"

"نہیں ـــ"

"او جانے دو ـــ مجھے پہلے ہی پتہ تھا ـــ میرا دل کہتا تھا تم میرے ساتھ فلرٹ کر رہے ہو ـــ مجھے پتہ تھا ـــ جانتی تھی میں ـــ کئی لڑکیوں کے ساتھ تمہارے افیئر ہوں گے ـــ اپنی بلٹ میں ایک اور چھید ڈال لینا قیصر ـــ ایک اور ہول ـــ"

بجلی کے کھمبے کا بلب فیوز ہو گیا اور وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا ـــ پیا کے چہرے پر پتہ نہیں کب کے رُکے ہوئے آنسو بہنے لگے۔ اس نے دھکے سے گاڑی کو سٹارٹ کیا اور موڑ کاٹ گئی۔ پڑھنے کا جو تازہ تازہ عہد اس نے کیا تھا وہ اسی کار کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہسپتال کی سیڑھیاں چڑھتے وقت قیصر کو علم نہ تھا کہ اتنی بڑی بات بھی ہو سکتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ پیا کے گھر والوں نے اسے ڈرانے دھمکانے، نوٹس دینے کے لیے ہسپتال

میں طلب کیا ہے۔ بھلا پیا جس کے درمیانی دو دانتوں کے بیچ خوش دلی رہتی تھی یوں اپنی جان لے سکتی ہے؟

لیکن جس وقت وہ پرائیویٹ کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں دبی دبی سسکیوں کا شور تھا۔ نہ جانے پلنگ کے اردگرد کون عورتیں تھیں لیکن جس لڑکی کو وہ جانتا تھا اس کے چہرے پر چادر تھی اور پائنتی کمبل سے ایک پاؤں باہر تھا جس پر شاکنگ پنک شاکنگ تھی۔

قیصر نے دونوں ہاتھوں میں اس پاؤں کو پکڑ لیا۔ سلیپنگ پلز نے اس جاندار پاؤں کو بھی ابدی نیند سُلا دیا تھا۔ پتہ نہیں کب سے قیصر کی بنیاد میں پانی گر رہا تھا۔ بظاہر تو وہ تنومند درخت تھا لیکن اندر سے مٹی پولی ہو چکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سب کے سامنے وہ تیورا کر نہ گرے۔

سرکاری گاڑی کی ونڈ سکرین پر خزاں دیدہ پتے گر رہے تھے۔ کہیں سے برسن ہار بادل آسمان پر اکٹھے ہو گئے تھے اور اکا دکا بوندیں بھی شیشے پر پڑنے لگی تھیں۔

قیصر سوچ رہا تھا کہ میں جو اپنی ماں کا کرشمہ ہوں، اس واقعے کے بعد میں اس ماں کے لیے کیا کر سکوں گا؟ جبکہ میں پیا کے لیے اس کے گھر تک نہ جا سکا۔

ونڈ سکرین اس کے آنسوؤں سے دھندلا رہی تھی۔ انگریزی زبان اور MANNERS نے اس میں ایک لاچاری پیدا کر دی تھی۔ ماما کی جھڑکیاں سہہ سہہ کر وہ بزدل ہو چکا تھا ـــ پرائیویٹ کلینک سے بڑی دور آ کر اس نے گلو بکس کے اوپر دھرے ہوئے اپنے باپ کے سگریٹ کیس کو کھولا۔ پہلا سگریٹ سلگایا اور سوچا ـــ بھلا میں پیا کے لیے کر بھی کیا سکتا ہوں جبکہ میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ پیا کا اصلی نام کیا ہے؟

———

ہوتے ہوتے

ہوتے ہوتے، گرجتے گرجاتے، کھڑکتے کھڑکاتے، رنگتے رنگاتے، گھرتے گھراتے مرتے مارتے عمر گیرو کپڑے پہننے کی آگئی۔ بائیں آنکھ میں موتیا اترنے لگا تھا۔ سوغات کے طور پر کوئی کوئی بال سیاہ رہ گیا تھا۔ چھ فٹ ایک انچ لمبا ملک آصف جب قدآدم آئینوں کے سامنے سے گزرتا تو اسے احساس ہوتا کہ جسم میں نستری ہوئی فصلوں جیسی لچک نہیں رہی۔ اب اس کے وجود سے شوکت کا لفظ چسپاں نہیں ہوتا تھا۔ وہ فراری ملزموں کی طرح لمبے برآمدے میں سے گزر جاتا جس میں اس کے دادا کے وقتوں کے قدآدم آئینے ترتیب وار لگے تھے۔ ملک آصف نے جب اس صیدگاہ میں آنکھ کھولی تو ساری زندگی کو ہی ٹھٹھا مذاق سمجھا ــــ آج بھی اتنی عمر گزر جانے کے بعد وہ اندر سے بالکل کاکا سا تھا جو پاؤں پر پاؤں دھرے راکنگ چیئر میں دھنسے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ قلا بازیوں کی عمر بیت چکی تھی لیکن اندر اب بھی وہ سمر سالٹ کھاتا رہتا بلکہ اس آخری سمر سالٹ نے تو اس کے سارے جسم کے پٹھے ہی چڑھا دیئے تھے۔

یہ پچھلے تیس سال اس کے اور ملکانی آمنہ کے درمیان کیا تھا؟

محبت؟ سمجھوتہ؟ مصلحت؟ جھوٹ؟ رواداری؟ دھرما دھرمی؟ کام چلاؤ؟ بارہ کینال کی ٹھاٹھ دار حویلی نما کوٹھی میں آم کے درختوں میں چھپی کوئل کوک رہی

تھی ۔ فضا میں اجڑی سی پیلی روشنی تھی ۔ چند شہد کی مکھیاں کھلے برآمدے میں آجا رہی تھیں ۔ صبح سے ریڈیو پر سورج گرہن کی خبر آ رہی تھی ۔ ملک آصف کی بوڑھی ماں بڑا سے منہ کھولے ، ہاتھ میں تسبیح پکڑے ، ریڈیو لگائے کرسی پر بیٹھی سو رہی تھی ۔ وہ اِدھر اُدھر یونہی کرسیوں پر بیٹھ کر سونے کی عادی تھی ۔ جب ملک آصف کی بہو برآمدے سے گزرتی اور اس کی ٹکٹکاتی ہیل کا شور ہوتا تو بڑی ملکانی تڑپ جاتی اور مرچنگ سی آواز میں کہتی ــــ "اے پارو ، بہو سورج گرہن سے بچنا ــــ چلتے رہنا ــــ سورج گرہن بھاری چیز ہے ــــ قینچی سوئی کو ہاتھ نہ لگانا ــــ جانے بچے کے کس انگ پر نشان پڑ جائے ــــ"

اپنے کمرے میں حنوط چیتے کے سر پر پاؤں رکھ کر ملک آصف بندوق صاف کر رہا تھا ۔ جب بھی پارو یا ملکانی آمنہ برآمدے میں آتیں ، وہ بندوق صاف کرنا بند کر دیتا ــــ یوں لگتا جیسے اس نے پہلی بار کسی عورت کو دیکھا تھا ۔ بلکہ اس نے تو شاید پہلی بار اپنی کوٹھی کو دیکھا ۔ برآمدے میں بیٹھی ماں ، ہوا سے جھولتے کمروں کے ماڈرن پردے ، لان کا کچھ سوکھا حصہ ، ٹکڑیوں میں لگے ان ڈور پلانٹ ، پورچ میں اترنے والی سیڑھیوں پر دھرے سنگِ مرمر کے گملے اور ان گنت چیزیں جو برآمدے میں نئے کے ساتھ پرانی وجاہت کو ظاہر کر رہی تھیں یہ عکس وقت کی کینوس پر ٹھہرے ہوئے لمحے کی طرح اسے نظر آیا ۔

سمرسالٹ کھا چکنے کے بعد وہ حساب کرنے پر مجبور ہو گیا تھا ۔ ایک حساب کتاب ایسا بھی ہوتا ہے ۔ جس کے نفع نقصان کی کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہوتی ۔ جب بیلنس شیٹ تیار ہوتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ساری عمر نام میرا گاؤں تیرا ہی رہا ــــ ملکانی آمنہ کرائے پر بنی ہوئی عمارت تھی ۔ شک رہا کہ اب گری کہ گری لیکن لب دریا اس کی شان میں کبھی کمی نہ آئی ۔

کئی فلمیں ری وائینڈ ہو کر اس کے اندر چل رہی تھیں ۔

من موہنی صورتیں ۔۔۔۔ اسے لپ لپ کھانے والیاں ۔۔۔۔ قدموں سے لگی رہنے والی کٹیل عورتیں ۔۔۔ کھی کھی ہنس کر جی سائیں کہنے والی مٹیاریں ــــ وہ ساری بھیڑ کیسے چھٹی ؟ ان تمام صورتوں کے موٹف پر ایک چہرہ بار بار سوپر امپوز ہوتا تھا ۔ لمبی گردن والی نک طوطی ملکانی آمنہ جس کے کانوں میں چار چار ہیرے کی بالیاں تھیں ۔ ملک آصف نے ساری عمر آمنہ سے محبت نہ کی لیکن اس گندھے ہوئے آٹے کی بوری سے وہ کبھی آزاد بھی تو نہ ہو سکا ۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اگر وہ قصوروار تھا تو محبت تو آمنہ نے بھی کبھی ملک آصف سے نہ کی تھی ۔ آمنہ نے ملک آصف کے عشق میں سلیپنگ پلز ضرور کھائی تھیں ۔ بڑے بڑے گھروں میں آنسوؤں کی چھتیں گرا کر لوگوں سے ہمدردی بٹوری تھی لیکن اسے محبت تو نہیں کہتے ۔۔۔۔۔

اب ملک آصف کو پتہ چلا کہ محبت تو ملکانی آمنہ کو صرف اپنے بیٹے گل رُخ سے تھی ۔ ایسی محبت جو نقص بین نہیں ہوتی ۔۔۔ ستر پوش ہوتی ہے اپنی زندگی بسر نہیں کرتی ۔ بلکہ محبوب کی مرضی سے کٹتی ہے ۔۔۔۔ جس میں محبت کا اشتہار بے آبروگی کی صورت میں نہیں لگتا ــــ بس اخفا ہی اخفا ، ڈھکا ہی ڈھکا ، ستر پوشی ہی ستر پوشی ۔ ملکانی آمنہ کو جیسی محبت گل رُخ سے تھی ۔۔۔۔ اس انڈے سینے والی محبت کو دیکھ کر ملک آصف دنگ رہ گیا ۔۔۔ اس کے اندر والے کاکے نے ایسی قلابازی لگائی کہ جسم کے سلیٹے بیٹھے چڑ چڑھیلے کے حنوط سر پہ دایاں پاؤں رکھے گھٹنے پر بندوق جمائے برآمدے میں بیٹھی اپنی ماں پر نظریں جمائے وہ سوچنے لگا :

کیا مرد ، عورت اور بچہ ایک ازلی تثلیث ہے ؟

کیا مرد ، عورت سے محبت کرنے پر مجبور ہے ؟ یہ کیسی گلا دبانے والی رغبت

ہے جس سے مرد کبھی آزاد ہی نہیں ہو سکتا؟ بھر گرمیوں چلنے والے جھکڑ جیسی محبت جو عورت کا تنبو بھی اکھاڑ دیتی ہے اور مرد کا پرچم بھی دھجیوں میں بکھر جاتا ہے۔ کیا عورت ازل سے صرف بچے کی ہے؟ کہیں بچہ ہی تو وہ پھل نہیں تھا جسے چکھنے کے بعد عورت بہشت سے نکلی۔ کیا مرد ایک وسیلہ تھا، بچے تک پہنچنے کا.... خدا سے بچھڑنے کا... ہاں ملک نے آمنہ سے بڑی بے وفائیاں کی تھیں ــــ لیکن ملکانی گل رُخ سے نہ وفا مانگتی تھی نہ بے وفائی۔ اس ٹھاکر دوارے جس طرح ملکانی نے سیس نوائے، وہ جان ہارا منظر ہی کچھ اور تھا۔

بچپن سے ملک آصف نے چاندی کا چمچ منہ میں لے کر زندگی بسر کی۔ جب وہ ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں دھرے راکنگ چیئر میں دھنسے اپنے باپ کی شکل دیکھا کرتا، شاید تب بھی اس کی سائیکی کو معلوم تھا کہ کمروں میں ٹنگے ہوئے شیروں، بارہ سنگھوں، بنگال ٹائیگروں کے دھڑوں کی طرح وہ بھی بڑی بے مصرف زندگی گزارے گا۔ عورت، شراب اور بندوق سے دل بہلانے کے علاوہ اِسے اُس عطر کے پھوئیے جتنا بھی کام نہ تھا جس کی خوشبو کے پیچھے وہ لپکتا چلا جاتا، جس کی لگن میں وہ زندگی بسر کرتا۔ اس کے گاؤں کے غریب مزارعوں کا المیہ تھا کہ وہ ستم رسیدہ تھے۔ ان کا حاصل کم اور خواہش زیادہ تھی۔ آصف ایسے ماحول میں پلا تھا جس میں حاصل خواہش سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے ظلم، احساس کمتری، تنہائی، نقصان کی کوئی بھی معکوس مثبت شکل نہ دیکھی تھی، اس لئے وہ جد وجہد سے ناآشنا ہی رہا۔ اس کی زندگی میں کوئی مشن، تحریک، محبت، واقعہ، خیال ایسا رونما نہ ہوا جو اسے اپنی کوبرا جیسی انا سے آزاد کراتا ــــ اور اس طرح کچھ لمحوں کی فراغت ہوتی۔ کچھ عرصے کا سکون ملتا۔ آمنہ کی محبت لرزہ مانند چڑھی اور جھاگ آسا بیٹھ گئی ــــ نہ کوئی تبدیلی آئی نہ جہت مقرر ہوئی، نہ ہی بے مصرف زندگی میں

کوئی منزل مقرر ہوئی.... تیز ہوا میں اُڑنے والے ریت کے ڈھیر جیسے کبھی یہاں بیٹھ رہے کبھی وہاں۔

کل رات جب آمنہ ملکانی اس کے کمرے میں آئی تو پہلی بار ملک نے ایک چٹان دیکھی۔

"ملک آصف تم نے پارو کے ابا سے قبولا کہ گل رُخ شراب پیتا ہے؟ ــــ"

ملکانی کی آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"ہاں تو کیا گل رُخ شراب نہیں پیتا؟ ــــ میں نے کوئی جھوٹ کہا؟"

"پیتا ہے تو پیتا رہے لیکن اگر اس کا ذکر پھر تم نے کسی سے کیا ــــ تو تم دیکھو گے آمنہ کیا کچھ کر سکتی ہے ــــ"

ملک آصف کی آنکھیں چکی کے پاٹ ایسی کھلی رہ گئیں ــــ

"تم سارے رشتہ داروں میں کہتے پھرتے ہو کہ گل رُخ آوارہ ہے، رنڈیوں کے پاس جاتا ہے۔ اس کی ایک داشتہ میو روڈ پر رہتی ہے ــــ تم نے.... تم نے باپ ہو کر"

ملکانی کے کرتے کی گھنڈی گلے میں پھنسی ہوئی تھی اور الفاظ بڑے گھن گرج کے ساتھ اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ آصف نے آگے بڑھ کر ملکانی کے دونوں بازو پکڑ لئے۔ خمیر آٹے میں اس کی انگلیاں ہڈی تک چلی گئیں۔

"لیکن آمنہ میری ایک ایک بات تم نے.... تم نے سب کو بتائی۔ گھر گھر میرا چرچا کیا.... میری رسوائی، بدنامی کا باعث تم تھیں تم آمنہ ــــ کیا تم میرے عیب چھپا نہ سکتی تھیں؟ تمہارے سوا میرے گناہوں کو اور کون جانتا تھا؟"

"وہ اور بات تھی ــــ ملک آصف!"

"وہ کیا بات تھی ــــ؟" ملک آصف نے آمنہ کے بازوؤں پر گرفت اور مضبوط

کر کے پوچھا۔

"وہ حسد تھا —"

"اور یہ .... بیٹے کی باری .... تم اس کا ہر عیب چھپانا چاہتی ہو یہ کیا ہے؟"

"یہ محبت ہے .... اگر تم نے .... باپ ہو کر اس کی ستر پوشی نہ کی .... اس کے عیبوں کو اچھالا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی .... گل رخ شراب پیئے یاد ھتورہ .... وہ رنڈیوں کے پاس جائے چاہے داشتائیں رکھے .... میرے لئے وہ بے عیب ہے بے عیب تم باپ ہو کر بھی نہیں سمجھتے پیارے کا عیب عیب نہیں ہوتا .... اپنی کمزوری کوئی اچھالتا پھرتا ہے — عجیب باپ ہو تم بھی —"

"تو کیا میں تمہارا اپنا نہ تھا آمنہ؟ — مجھے تم نے کیوں بدنام کیا؟"

گہری رات کے سناٹے میں ملک آصف نے ایک ہی کھونچا مار کر ملکانی کا گریبان گھیرے تک پھاڑ دیا۔

"تمہیں اپنے پرائے کی کیا تمیز ملک آصف؟ تم تو بیٹے کی گاڑی پر بھی فائر کر سکتے ہو ..... اکٹھے چار فائر"

تو یہ محبت تھی جس کی تلاش میں برسوں وہ عورتوں سے گھوم گھوم سا ہوتا رہا تھا۔ یہ وہ جذبہ تھا جس کی تلاش میں اس نے کئی چہرے، کئی جلدیں، کئی ننگے جسم بیکار دیکھے تھے .... وہ اس جذبے کی تلاش میں ریت کی ڈھیری بنا کبھی یہاں سے وہاں .... اور کبھی وہاں سے اٹھ کر جہاں کہاں اُڑتا رہا — رات سمرسالٹ کھا کر اس کے سارے پٹھے چڑھ گئے تھے اور پتہ نہیں رات کے کس پہر میں پھر بندوق اس کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ ملک آصف کرائسس کے لمحوں میں صرف اسی بندوق کو دوست مانتا تھا....

ہوتے ہواتے، سنتے سناتے، ہنستے ہنساتے، روتے رلاتے، بکتے بکاتے،

چھینتے چھناتے، چلتے چلاتے اتنا عرصہ گزر گیا کہ ملکانی آمنہ کے سارے گوشت میں خمیر لگ گیا، آنکھوں تلے کوے کے پیروں جیسی جھریاں پڑ گئیں اور تھل تھل جسم پر جابجا لال کالے تل اور ماتھے پر بیر برابر گومڑا پڑ گیا جو دبانے پر بھی نہیں دکھتا تھا۔ آمنہ ملکانی نے رات والا کرتہ اتار دیا تھا پر اب تک وہ اپنے حواس میں آئی نہ تھی۔ نہ جانے گل رخ کہاں تھا۔ نہ جانے ملک آصف اب کیا کرنے والا تھا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹی تو نہ تھی۔

ملک آصف نے تو ساری عمر اسے ایسے چھوا تھا جیسے مٹی کی ٹھوٹھی سے انگلی کے ساتھ فرنی چاٹتے ہیں۔ ایکا ایکی اتنا غصہ تو شاید نس پھٹ جانے کی دلیل تھی۔ ملکانی اپنے کمرے کے دیوان پر لیٹی سفید مخمل کے گاؤ تکیہ پر کمر اور بازو دھرے باہر برآمدے میں دیکھ رہی تھی — آخر ملک آصف کو ہو کیا گیا تھا؟ اکٹھے چار فائر؟ کیا باپ بیٹا ازل سے ایک دوسرے کے دشمن ہیں؟

سورج کو پوری طرح گرہن لگ چکا تھا۔ برسات کی دوپہر جیسی روشنی برآمدے میں پھیلی تھی۔ حویلی کے باغ میں مزارعے ڈھول پیٹ رہے تھے۔ بہو پارو کا دروازہ کھلا تھا اور نائیلون جالی کے پردے ہوا میں لہراتے کھلے برآمدے تک آ رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پارو بہو اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے تک آئی تھی۔ اس کا پیٹ چادر کی اوٹ میں بڑا نمایاں تھا— پارو نے ہاتھ کی اوٹ کر کے آسمان کی جانب نظر کر کے سورج گرہن دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ دل میں آمنہ نے سوچا آج ہی سورج کی روشنی کو بھی چاند کی بے نوری نے کھانا تھا۔ کہیں آج قیامت کا دن ہی نہ ہو اور ابھی تھوڑی دیر بعد ساری حویلی .... گاؤں میں جمع گندم کے ڈھیر .... بور پر آئے آموں کے درخت، ٹیوب ویل سے نکلتا پانی، مزارعوں کے گھر سب پھوئی پھوئی اڑ جائیں .... اور کسی کو کسی کی خبر نہ رہے۔

لیکن ملکانی نے سوچا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے گل رُخ کی خبر نہ رہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بھی جنوبی پارو بہو کی طرح گل رُخ کو اُلٹا لٹکا دوں؟ اکٹھے چار فائر؟ نہ جانے کار کے اندر والے کا کیا حال ہو گا؟ ملکانی آمنہ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اب ایسے میں اُسے کیا کرنا چاہیئے۔

برآمدے میں ملکانی کی ساس ملکانی نور افشاں کندھے سکوڑے ہاتھ میں تسبیح لئے ریڈیو لگائے بیٹھی تھی۔ بڑی ملکانی ہمیشہ اسی طرح منی پلانٹوں کے آس پاس ملک آصف کے کمرے کا رُخ کئے بیٹھی رہتی تھی۔ اپنے پلنگ پر سونے جاتی تو نیند اُچاٹ ہو جاتی۔ آصف کا کمرہ نظر آتا تو شانتی سے اونگھنے لگتی۔ لان کا کچھ حصہ گرمی میں سوکھ چکا تھا اور لوکاٹ کے پیڑوں پر کوئی کوئی لوکاٹ ایسا باقی تھا جس کے گرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں ملکانی آمنہ اپنا اعمال نامہ گود میں لئے مخملیں گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

ایسا ہی مٹی رنگا دن تھا اسی طرح آم کے باغ میں ڈھول تاشے بج رہے تھے جب وہ بیاہ کر یہاں آئی اس روز کہیں سے ٹڈی دل اُٹھ کر آیا تھا۔ سارے گاؤں والے ٹڈی دل کے پیچھے بھاگ رہے تھے! انار چھوٹنے پٹاخے چلنے کی آواز آتی تھی۔ آمنہ ملکانی کا دل اسی روز ڈوب گیا۔ جب بازو سے بندھے مولی کے دھاگے میں چاندی کے گوکھڑو پر ایک ٹڈی آکر بیٹھ گئی اور مہری گیتو نے جب ٹڈی مارنی چاہی تو شگن کا ناریل دو حصے ہو کر پلنگ پر گرا ملکانی نور افشاں جو وارنے کا دودھ لئے کھڑی تھی، مہری گیتو سمیت کمرے سے غائب ہو گئی۔

کیا واقعی مجھے ملک آصف سے محبت ہوئی؟ کہ وہ بھی انا ہی کا ایک مسئلہ تھا۔ اپنے عکس سے کون محبت نہیں کرتا؟ ملک کی آنکھوں میں ان دنوں میں ہی میں تھی .... تھی .... نہیں تھی .... تھی .... بہت تھی .... نہیں تھی....

نہیں تھی نہیں تھی املتاس کے زرد خوشوں میں کوئل نے جیسے چڑانے کو کئی تانیں لگائیں لیکن جب دوسری عورتوں کے سانسوں سے آئینہ دھندلا جائے اور اپنا عکس نہ دکھائے تو کیا پھر بھی محبت رہتی ہے؟ مرد اور عورت میں یہ کیا چکر تھا؟ اپنی ذات کے عکس کا؟ اپنی ذات کی بقا کا؟ وہ سوچنے پر مجبور تھی کیونکہ ساتھ والے کمرے میں رات سے ملک آصف بندوق گھٹنے پر رکھے گم سُم بیٹھا تھا۔ چیتے کے سر پاؤں ٹکا کر پاؤں گھٹنے پر رکھنا کسی قیامت کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا؟

ملکانی آمنہ سوچ رہی تھی.... جلدی جلدی .... علیحدہ علیحدہ... جوڑ جوڑ کر کیا مرد کو کبھی بچے سے محبت ہوتی ہے؟ کیا بچہ ہمیشہ عورت کا ہوتا ہے؟ سوائے وارث سمجھنے کے ملک آصف نے گل رُخ کو کیا سمجھا؟ رات کے واقعے کے بعد اب وہ اور کیا سمجھے؟ اس بات کا احساس بھی اسے جلدی نہ ہوا۔

ملکانی آمنہ کی شادی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ہنگاموں، سمجھوتوں، لڑائیوں کے ان گنت سلسلوں کے بعد دو اونچے فردوس مکانی قسم کے گھرانوں میں یہ رشتہ طے پایا تھا۔ سال بھر تو محبت کا جھکڑ خوب چلا دونوں کو ایک دوسرے کے پل پل کی خبر رہتی پھر کہیں سے گل رخ آ گیا.... تب آمنہ کو علم نہ تھا کہ ایک تیسرے کے آتے ہی ملک آصف کی جنت ڈھے گئی ہو گی۔

وہ لاپروا ہونے لگا۔ اس کے جو کام کر دیئے جاتے ان کی اسے پروا نہ ہوتی لیکن جو کام نہ ہو سکتا اس کی شکایت سب کے سامنے ہوتی۔ وہ اپنے خاندان کا ملکانی کے خاندان سے مقابلہ کرنے لگا تھا۔ دونوں کی پسند نا پسند ایک دوسرے کے سامنے ڈھال بن کر آنے لگی۔ عادتوں کا فرق جی کو کھلنے لگا....

تب ملکانی کو علم نہ ہو سکا کہ ملک آصف کسی دوسرے کو برداشت کرنے والا آدمی نہیں.... کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اگر اس نے گل رُخ کو اٹھایا ہو تو ملک آصف

اُلٹے پاؤں برآمدے میں کیوں چلا جاتا ہے؟ کیا مرد اپنی اولاد سے کبھی محبت نہیں کرتا؟

ان ہی دنوں ملک آصف رات گئے کاموں آرائین کی شہتوت رنگی لڑکی بغل میں داب اس کے کمرے میں داخل ہوا— ملکانی کے لئے یہ منظر نیا نہ تھا— اس کے اپنے گھر میں ایسے بہت سے واقعات ہو چکے تھے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں عشق جو لرزے کی طرح چڑھا تھا بہت سارے پسینے کے ساتھ اُتر گیا۔ اس کی محبت ساری کی ساری دوپٹہ کی طرح اُتر کر انا کی کھونٹی پر لٹک گئی۔ دوسری صبح ملک آصف کے پہلو میں نہ بوتل تھی نہ شہتوت رنگی لڑکی، وہ سر سے پاؤں تک انفعال تھا۔

"سنو آمنہ .... حویلی میں کسی کو علم نہیں کہ میں ..... میں شراب پیتا ہوں۔ بڑی ملکانی کو علم ہوا تو وہ صدمے سے مرجائیں گی— تم .... اگر چپ رہیں تو .... پھر ایسا واقعہ نہ ہوگا—"

لیکن ملکانی آمنہ کو غم و غصے سے سانس نہیں آرہا تھا۔ وہ ادھڑی چارپائی کی طرح ایک ہی رات میں خالی ہوگئی تھی۔ پھر اُس نے اپنی ماں کے گھر فون کیا۔ بہنوں کو واقعے کی ساری تفصیلیں بتائیں۔ گھر کی اصیلیں مہریاں اکٹھی کر کے کاموں آرائین کے دیہے پیٹے۔ شہتوت رنگی کو بلا کر شہتوت ہی کی لچک دار چھڑی سے پیٹا— گلے سے لپٹنے والے گل رُخ کو چارپائی پر پھینک کر اُونچے اُونچے بین کئے۔

آمنہ جلی .... بھنی .... مروڑے کھاتی .... کھے اُڑاتی حویلی کے اندر باہر کھلتی رہی۔

ایک روز ایسی ہی روشنی تھی— بارش آنے والی تھی اور لوکاٹ کے جھنڈ

میں رہ رہ کر کوئل کوکتی تھی۔ دوپہر کو شام کا سایہ ہو گیا تھا۔ سارے میں آم کے بور کی خوشبو تھی۔ ملکانی نور افشاں اس کے کمرے میں آئی تھی۔ بڑی پتلی جلد والی نک طوطی بڑی ملکانی جس کی ٹھوڑی دوھری، دھن مضبوط اور گردن میں لوہا گڑا تھا۔ بڑی ملکانی کے پاس ہیرے کے زیورات، پشمینے کے شالیں، کٹ گلاس کے ظروف، شکار گاہی کے قالین، یخ دانوں میں بھری بنارسی ساڑھیاں، بروکیڈ کمخواب کے غرارے، اخروٹ کی لکڑی میں ہاتھی دانت جڑا فرنیچر، کوفی حروف میں لکھے قرآن کریم، کئی پشت پرانی مرصع تلواریں، ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگ آزادی سے پہلے کی توڑے دار بندوقیں، ٹیپو سلطان کے عہد کے فرغل .... اور ان کے علاوہ ان گنت نوادرات اور عجائبات تھے لیکن اس وقت وہ بالکل ننگی بچی عاجز نظر آتی تھی۔

ملکانی نور افشاں نے اپنے لرزتے وجود کو استقامت دینے کے لئے مہاگنی کے پلنگ کا پایہ پکڑا۔ مقیش لگے سیاہ دوپٹے سے چہرہ پونچھا اور بولیں— "آمنہ میں بھی برسوں سے جانتی ہوں کہ آصف شراب پیتا ہے۔ لیکن میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا— اس لئے بات نہیں پھیلی .... اگر تم ملک آصف کو بدنام کروگی تو ....؟"

"جی تو کیا؟—" اپنی قمیض پر گل رُخ کے نیپی کا سیفٹی پن لگاتے ہوئے آمنہ بولی۔

"چلو تمہیں آصف پر ترس نہیں آتا نہ سہی .... آنا بھی نہیں چاہیئے۔ کسی زخمی عورت کو آج تک کسی مرد پر ترس نہیں آیا؟ پر عزت کوئی ایک پشت کا کھیل نہیں— عزت تو بنی رہنے دو اس کی۔"

"آپ خوب جانتی ہیں ایسی باتوں سے ملک آصف کی عزت کم نہ ہوگی۔"

آمنہ غرائی ملکانی نور افشاں نے کبھی کسی سے کچھ نہ مانگا تھا۔ بھیک مانگی نہ ملی تو وہ چپ چاپ باہر جانے لگی پھر لوٹ کر گل رُخ کے پنگھوڑے کے پاس آئی اور جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "جب گل رُخ جوان ہوگا آمنہ بہو تب تم کو میری بات سمجھ آئے گی لیکن تب وقت گزر چکا ہو گا.... ایسے ہی ہوتا ہے ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔"

اگر ملکانی آمنہ چپ رہتی تو ہو سکتا ہے ملک آصف تائب ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے پھر بھی وہ اندھیرے سویرے اندر ہی اندر اس کی بانہہ مروڑتا رہتا۔ انسان کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جب آہستہ آہستہ .... بہت آہستہ آہستہ ملکانی آمنہ نے دوسری عورتوں اور شراب کو قبول کر لیا تو اسے ملک آصف پر کچھ اتنا غصہ بھی نہ رہا۔ اب وہ بیساکھی پر چلنے لگی — کبھی ملک آصف کی بیساکھی، کبھی گل رُخ کی لیکن پھر کبھی ملک آصف اس کی زندگی کا مرکز نہ بن سکا — مرکز میں صرف گل رُخ تھا .... آہستہ آہستہ قد نکالتا .... گورا چٹا .... مضبوط کاٹھی کا نک طوطا۔

باہر سورج گرہن کی پیلی سیاہی مائل روشنی پھیلی تھی۔ اس کی ساس نور افشاں منی پلانٹ کے جھرمٹ کے پاس ملک آصف کے کمرے کی طرف رُخ کئے ریڈیو لگائے گھٹنے پر ہاتھ میں تسبیح پکڑے اونگھ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے پارو بہو اپنے گول مٹول پیٹ پر دوپٹہ تانے سیڑھیوں تک آئی تھی۔ اس نے چہرے پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ خوش اعتمادی، سچائی اور دولت نے اس کی چال میں نمائش پیدا کر رکھی تھی۔

پارو بہو کو کھڑکی سے دیکھ کر آمنہ ملکانی نے سوچا آخر پارو بہو اور ملک آصف کی محبت ایک سی کیوں ہے؟ میں گل رُخ کے سارے عیب چھپاتی ہوں، یہ دونوں سب کے سامنے ان خرابیوں کو دھجی دھجی بکھیرتے ہیں۔ میں محبت کے

ساتھ اس کی تربیت کرتی آئی ہوں، یہ دونوں اسے عبرت دلانا چاہتے ہیں۔ سبق سکھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ محبت کا تو علم ہی اسے اب ہوا جب گل رخ کالی سرسنڈیز میں اچانک حویلی چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اپنا دل ٹٹولنے پر اسے پتہ چل چکا تھا کہ اس کی ساری کائنات، جذبے، فلاح، خوشی کا نام صرف گل رُخ ہے لیکن ملک آصف کے لئے گل رُخ کون تھا؟

چار فائر کرنے کے بعد بھی وہ چیتے کے سر پہ پاؤں اور گھٹنے پر بندوق رکھے کس کا منتظر تھا؟

اپنی دولت پہ پلنے والے پیراسائیٹ کا؟
بے شمار جائیداد برباد کرنے والے وارث کا؟
ملکانی آمنہ کا؟ یا بہو پارو کا....؟

ملک آصف کو بیٹا تو درکار ہی نہیں تھا۔ فیوڈل سسٹم وارث پر فخر کرتا ہے۔ جب نیلی پگڑی پہن کر گل رُخ ایچی سن کالج جاتا تو ملک آصف کے چہرے پر اسے دیکھ کر تیوری ابھرتی۔ وہ اس بونے کو اپنی ساری جائیداد تو دے سکتا تھا۔ لیکن اپنے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک سلائیس کاٹ کر بھی نہیں دے سکتا تھا۔

پچھلی رات حویلی میں دیواریں دروازے جڑ سے اکھاڑنے والا جھکڑ چلا۔ بہو پارو کے کمرے میں سے جو اجنبی بھاگا تھا، اس کے پیٹنٹ لیدر کا ایک جوتا بہو پارو کے کمرے میں ہی رہ گیا۔ گل رخ نے شراب میں دھت اتنے اونچے اونچے گالیاں دیں کہ ملکانی اور ملک بھی ان کے کمرے میں لڑھکتے آگئے۔

ملکانی آمنہ کے جسم میں آگ چل پھر رہی تھی۔ ملک آصف پکی برجی جیسا بغیر پلکیں جھپکائے دروازے میں کھڑا تھا۔

”تم نے پارو بہو سارے میں ملک گل رخ کو بدنام کیا میں چپ رہی ..... اور اب اتنی بدنامی کے بعد..... اب .....“ قالین پر پڑے پیٹنٹ لیدر کے جوتے کو ٹھوکر مار کر ملکانی آمنہ بولی۔

”تم چپ کرو آمنہ ہر عورت بیٹے کا راز چھپاتی اور شوہر کے نقص بیان کرتی ہے ..... پارو بہو بھی اپنے بیٹے سے محبت کرے گی..... ہمیں بھی بس اتنا چاہیئے ــــ ایک پوتا ..... گل رخ کا وارث ..... یہ جوتا بے معنی ہے ..... عورت صرف بیٹے سے پیار کرتی ہے۔ گل رُخ اس واقعے کو بھول جاؤ ..... تمہارا پارو بہو سے صرف بیٹے تک کا رشتہ ہے“۔ گل رُخ کا توازن بگڑا وہ ڈریسنگ ٹیبل سے جھولتا پلنگ تک اور پھر ڈولتا لڑھکتا صوفے کی طرف چلا۔

”میں اُسے طلاق دے دوں گا..... ابھی اس وقت“

”میں تمہیں شوٹ کر دوں گا گل رُخ ــــ ہمارے خاندان میں آج تک کسی مرد نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ میں ..... یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ نہیں کر سکتا ــــ“ جب ملک آصف بندوق لینے کے لئے لوٹا، تین طلاقیں پوری ہو چکی تھیں تب ملکانی نے ملک آصف کی سیاہ مرسڈیز کی چابی بیٹے کو تھمائی اور اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل کر بولی:

”چلا جا ..... تیرا باپ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے ..... چلا جا وہ بندوق لینے گیا ہے“۔ جب ملکانی آمنہ کے کانوں نے جاتی کار پر اکٹھے چار فائیروں کی آواز سُنی تو وہ کونتی ہوئی ملک آصف کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”غضب سائیں کا ملک آصف ــــ کیا ماں اپنے بیٹے پر فائر کر سکتی ہے ــــ؟ تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ کیا طلاقیں نہیں ہوتیں، کوئی بیٹے پر فائر کرتا ہے ــــ وہ بھی اکٹھے چار فائر؟“

ہوتے ہواتے، کھیلتے کھلاتے، پڑھتے پڑھاتے، سجتے سجاتے، خرچتے خرچاتے گل رُخ جوانی میں ہی گنجا موٹا اور اپنے دادا کی طرح جوڑوں کے مرض کا شکار ہو گیا۔ چالیس مربع کی آمدنی پر پلنے بڑھنے، رعب جمانے والے اس کے آباؤ اجداد نے اس کے لہو میں ہمیشہ دھما چوکڑی مچائے رکھی حتیٰ کہ اس نے کالج میں ہی ایم اے کے آخری سال میں پارو سے بیاہ رچا لیا۔

پارو انگریزی ایم اے میں گل رُخ کی ہم جماعت تھی۔ وہ حساب جوڑنے، امکانات پر دھیان کرنے، نقصانات پر چڑنے اور فائدے پر خوش ہونے والی لڑکی تھی ــــ اس کا بزنس میں آیا فیوڈل داماد کی چربیلی کاٹھی، مرنجان مرنج طبیعت اور نقصان پر نہ تلملانے والی سرشت سے خائف تھا لیکن پارو ضدی، ہٹیل، کٹیل لڑکی تھی۔ وہ کب باپ کی مانتی تھی ــــ آکسفورڈ سٹریٹ لندن سے خریدے ہوئے کپڑوں میں رنگ بدلتا گل رُخ، بزنس مین گھرانے کے لئے ایک نیا کھلونا تھا۔

لیکن خود گل رُخ کے لئے سب تجربے، واقعات، مشغلے بیکار تھے جیسے اندھے لوگ پر اُمید بنے رہنے پر بھی بے آس ہوتے ہیں؛ ایسے ہی گل رُخ پیدائشی طور پر جیلی تھا۔ خواہشات پوری ہو ہو کر اس پر گرتیں۔ وہ اپنی زندگی کا مصرف جاننا چاہتا تھا؛ لیکن مصرف اس کے اختیار میں نہ تھے۔ وہ دنیا حاصل کرنے کیلئے جدوجہد اس لئے نہ کر سکتا تھا کہ پشت ہا پشت سے کمائی ہوئی دنیا کے انبار اس کے ارد گرد تھے! اس نے شروع بلوغت میں امپونڈ پاورٹی کا سہارا لینا چاہا۔ وہ پرانے لنڈے کے کپڑے، پھٹی جوتیاں، سادہ کھانا، فرشی بستر استعمال کرتا، بھر گرمیوں میں گرم پانی پیتا رہا لیکن اس غریبی کے تصور میں سچائی نہ تھی اس لئے بہت جلد وہ وراثت میں ملی ہوئی بے معنی علتوں میں پھنس گیا۔

اپنے باپ دادا کی طرح وہ بھی دل کا اچھا تھا لیکن برائیاں، غلط کاریاں اس کے طریق زندگی کا لازمی جزو تھیں ـــ

اپنی زندگی کے لئے جب وہ کوئی منزل، مشن، تحریک، جدوجہد تلاش نہ کر سکا تو بانجھ خوابوں کے حوالے سے زندہ رہنا اس کا طریقہ بن گیا ـــ اب ان خوابوں میں وہ بھبھوت ملے فقیر سے لے کر نوبل پرائیز لینے والے سائنس دان کی مکمل زندگی بسر کرتا۔ اونچے اونچے عزائم کے ساتھ ساتھ کم عملی کی آسودہ زندگی نے اسے نڈھال کر دیا۔ کچھ تو آسودگی، کاہلی کسلمندی نے اسے دبوچا کچھ بلا مقصد جدوجہد اور اندھے جذبوں نے اس کی تلوار توڑ دی۔ اسی لئے جب اسے اپنی کنپٹی پر بندوق کے فائر کی پہلی پہلی آواز محسوس ہوئی اس نے گھبرا کر پارو سے شادی کر لی ـــ

لیکن عورت، شراب اور بندوق جو آج تک اس کے خاندان کے نیوروسس کو کم کرتی رہی تھیں اس کے لئے بیکار تھیں۔ یہ نہیں کہ وہ ان تینوں کا سہارا نہیں لیتا تھا لیکن پشت ہا پشت کی رنگیلی زندگی نے اس کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ وہ پہروں اپنی خاندانی رائٹنگ چیئر میں بیٹھ کر ڈولتا رہتا۔ برآمدے میں اس کی دادی بڑی ملکانی کا ادھ کھلا منہ اور اونگھتا چہرہ اسے نظر آتا۔ وہ سوچتا مجھ میں اور دادی ملکانی میں صرف سالوں کا فرق ہے ـــ یہ بھی بے مصرف ہے اور میں بھی زندہ رہنے کے لئے کوئی جواز پیش نہیں کر سکتا ـــ پھر جب گابھن پارو نے اسے نامرد مشہور کرنا شروع کر دیا تو پہلی بار اس نے اپنے اردگرد دیکھا ـــ وہ نہ پارو کی پھیلائی ہوئی بدنامی میں دلچسپی رکھتا تھا نہ ہی اس کے نزدیک پارو کی کوئی اہمیت تھی۔ لیکن اسے نظر آنے لگا کہ اب جب پارو لیٹتی ہے تو اس کا پیٹ پسلیوں سے اوپر سانس لیتا نظر آتا ہے پھر ایسے

میں اگر بچے کا باپ میں نہیں تو اور کون ہے؟

ایسے ہی ارب کھرب وسوسوں نے اسے زندہ کر دیا اور وہ بلا اطلاع اچانک سرپرائیز وزٹ کے لئے حویلی آنے لگا۔ پچھلی رات جب وہ گھر لوٹا تو دروازہ پر اس نے تین بار دستک دی جب دروازہ کھلا اور ایک نوجوان اس کے پاس سے گزرا تو گل رخ شراب کے نشے میں لڑکھڑا رہا تھا۔ اگر وہ ہوش میں ہوتا تو ایک جوتا پہنے سانولے نوجوان کو وہ پہلی نظر میں پہچان لیتا ـــ لیکن وہ جب سے پیدا ہوا کچھ بھی دیکھنے سمجھنے جاننے کا عادی نہ تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے قالین پر پڑے پیٹنٹ لیدر کے جوتے کو اونچی ٹک لگائی اور چلایا۔ "نکل جاؤ میرے گھر سے فاحشہ عورت .... آج میں نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے"

وہ اس زور سے دھاڑا کہ ملکانی آمنہ اور ملک آصف بھی برآمدے میں بھاگتے کمرے میں آوارد ہوئے ـــ اور جب تک ملک آصف کی چار گولیوں کے فائر کار پر نہ ہوگئے اسے کچھ بھی سمجھ نہ آیا ـــ

ہوتے ہواتے، گنتے گناتے، بڑھتے گھٹاتے، لوٹتے لٹواتے، جوڑتے جڑاتے خرچتے بچاتے پارو اس گھر کی بہو بن گئی تھی ـــ وہ جس گھرانے سے آئی تھی وہاں لوگ سکیموں کے سہارے زندہ تھے رپوٹیں ان کا لہو گرمائے رکھتی تھیں۔ نفع نقصان ان کے سانس ناہموار کرنے کو کافی تھے۔ پارو بہو نے اس حویلی میں آکر دیکھا ـــ وقت بالکل ساکت تھا ـــ برآمدے میں شہد کی مکھیاں آنند سے گھومتی رہتیں۔ بڑی ملکانی جی، ہاتھ میں تسبیح لئے گردن نیہوڑائے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ دھرے ریڈیو لگائے نجانے کس صدی سے ایسے ہی اونگھ رہی تھیں۔

"سورج گرہن ہے بہو بیٹھ نہ جانا ـــ کیا پتہ بچے کے کس انگ کو گرہن لگ جائے"

لیکن پارو بہو سوچ رہی تھی کہ گرہن تو شاید اسی روز لگ گیا تھا جب اس نے بے دھیانی، سرخوشی یا بے وقوفی میں آکر جیلی فش گل رُخ سے شادی کرلی تھی، وہ گل رُخ کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی، وہ نامرد نہیں سرے سے مردہ تھا۔ پارو بہو نے پہلے دلارے، پھر پھٹکارسے اور آخر میں الزام لگاکر گل رُخ کو زندہ کرنا چاہا۔ وہ زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی تھی اور گل رُخ اس کا بوجھ کندھوں سے اُتار پھینکنے کا آرزومند تھا۔

پارو کا گھرانہ دولت میں کسی سے کم نہ تھا۔ لیکن ان کے گھر میں دولت جیتی جاگتی تھی، دوسروں کو بھی سونے نہ دیتی اور خود بھی آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ اس کے اباجی کی جیبوں میں اتنے پیسے نہیں تھے جتنی سکیمیں تھیں۔ وہ ہر چھ ماہ بعد نیا کومپلکس، نئی بلڈنگ، نئے مینوفکچر کو مارکیٹ میں پھینکتے تھے۔ یہاں دولت آندھی کی طرح اڑائے پھرتی لیکن حویلی کی امارت نے کبھی گل رُخ کے گھر والوں کی نیندیں اچاٹ نہ کی تھیں۔ پارو بہو تو ماچس کی تیلی جیسا اثر رکھتی تھی کہ جدھر جاتی پھونک اُڑاتی۔ پارو کا خیال تھا کہ وہ گل رُخ کے منہ سے پشتنی دولت کی تمام چوسنیاں نکال پھینکے گی۔ اس کے اپنے گھر میں تو بنک بیلنس نے اتنی ٹنشن پیدا کر رکھی تھی کہ وہ لوگ بیٹھ کر تسلی سے کھانا بھی نہ کھا سکتے تھے ــــ اِدھر آئے اُدھر گئے۔ یہاں بیٹھے، وہاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

گل رُخ سے آنکس فراوانی اور شہنشاہ مزاجی نے محنت کی تمام آسائشیں چھین رکھی۔ پارو آنکس مارتی، وہ کروٹ لیتا اور پھر سو جاتا ــــ شروع شروع میں پارو نے اپنے بزنس مین والد سے کئی فیزیبلٹی رپورٹیں بنوائیں۔ کئی فیکٹریوں کے منصوبے بناکر لائی لیکن گل رخ پیسے کی بڑھوتری سے خوفزدہ تھا۔

وہ سوچتا ابھی میری زندگی کا کوئی مصرف نہیں، اگر فیکٹریاں مایا داس بن گئیں

تو پھر میں کیا کروں گا۔

"ہم ہسپتال بنوائیں گے، سکول کھولیں گے ــــ ذہین طلباء کو وظیفے دیں گے گل رُخ" پارو بہو اکساتی۔

"میں کسی شخص میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتا کہ اس کی فلاح کے لیے کوشش کروں ــــ"

"چلو تم کسی شخص کو قتل کر دینا اور ساری عمر مقدمے لڑنا ــــ"

"میں جو مشکل سے ٹائیلٹ جاتا ہوں مقدمے کیا لڑوں گا پارو بیگم؟"

"تو پھر.... تو پھر بغیر کسی کام کے صرف عورت شراب اور بندوق کے سہارے اتنی لمبی عمر کیسے گزرے گی ــــ؟"

"جیسی میرے باپ دادا کی گزر گئی پارو.... جیسی میری دادی کی گزر رہی ہے۔"

کہیں پھر کوئل کوک رہی تھی اور برآمدے کی زرد روشنی میں ملکانی نور افشاں ہاتھ میں تسبیح لئے اونگھنے میں مصروف تھی۔ پتہ نہیں کیوں پارو کو اپنا باپ یاد آگیا، وہ اس سارے ماحول سے کتنا مختلف تھا؟

صبح تڑکے اُٹھتا اور نماز پڑھتے ہی گھڑ سواری کے لئے چلا جاتا.... واپسی پر ایک پیالی چائے کے ساتھ تین بسکٹ۔ اس کا سارا دن گھڑی، روٹین اور ڈسپلن کے تابع تھا۔ اس میں سب محبتیں، نفرتیں، کام، فائدے نقصان، رشتہ داریاں اپنے اپنے مقام پر اپنی اپنی اہمیت سے تھے۔ کوٹھی کے تمام درخت ایک سے فاصلے پر تھے۔ تنوں پر چونے کا پانی تھا، سڑکوں پر بجری تھی، ڈرائیووے پر کبھی کوئی سگریٹ کا ٹکڑا، ٹافی کی پنی، کاغذ کی کترن پڑی نہ ملتی۔ یا وہ فنانس کی کتابیں پڑھتے یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے گیزٹیئر۔ اباسب کچھ بڑے اہتمام سے کرتے تھے، پر بیت سے نہیں۔ مقررہ کرسی، مقررہ برتن ــــ مقررہ ٹائم ٹیبل ــــ اس شخص کی تربیت یافتہ پارو کیلئے

ان سویٹ آف رومز میں رہنا مشکل تھا جہاں چیزوں سے لے کر انسان تک بے قاعدہ بے فائدہ لڑھکتے پھرتے تھے۔

کرائسس کی رات سے بہت پہلے کی بات ہے ایک روز پارو نے آخری بار آنکس سے مردار ہاتھی کی جلد ٹھونکی۔

"اُٹھو کچھ کرو گل رُخ خدا کے لئے ــــ کب تک پیتے رہو گے؟"

"کیا کروں؟ ــــ" کروٹ لے کر گل رُخ نے پوچھا۔

"تم ایک بچے کے باپ بننے والے ہو۔ کچھ اسی کے لئے زندگی کے آثار پیدا کرو، اپنے بچے کے لئے کچھ زندہ ہو جاؤ۔"

"وہ بھی آکر روتا رہے گا ــــ رونے دو" پاگل گنجے مارلن برانڈو جیسا گل رخ بولا بڑی نفرت سے پارو نے کہا ــــ "پتہ ہے تم مجھے اس نیرو کی یاد دلاتے ہو جو بنسری بجاتا رہا اور سارا روم جل گیا ــــ"

"ہاں ہم دونوں میں مشابہت ہے ــــ دونوں کے لئے زندگی بے معنی ہے۔"

"گل رُخ تم یہ مت سمجھنا کہ میں ہمت ہار دوں گی۔ میرے باپ کے نزدیک سک انڈسٹری کوئی چیز نہیں ہے، وہ ہر مردہ فیکٹری میں روح پھونک سکتا ہے۔"

"پھر؟ ــــ"

"میں تمہارے متعلق ایسی افواہ اڑاؤں گی کہ تمہارے گھر کا بچہ بچہ زندہ ہو جائے گا.... تم اگر میرے بچے کے لئے زندہ نہ ہوئے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم میں جلے پیر کی بلی آ بسے گی اور تم یوں لیٹنا، بسورنا اور ہوا خارج کرنا بھول جاؤ گے ــــ"

ایسے ہی ہوا۔

پارو نے کاموں میراثن کی شہتوت رنگی کو بلا کر رازداری سے بتایا کہ

گل رُخ نامرد ہے اور اسی لئے پارو تنسیخ نکاح کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ شہتوت رنگی نے یہ تو سوال نہ کیا کہ اگر گل رُخ نامرد ہے تو پھر پارو بہو کیسے بھاری قدم لئے برآمدے میں پھرتی ہے ــــ لیکن اس نے اس راز کو گیتو مہری کی بھانجی کو بتایا ــــ بھانجی نے بہشتی کی سالی سے بات کی۔ ہر بالی سالی نے پانچ مردوں میں قہقہہ لگا کر پرالی پھینکنے کے انداز میں بات کی.... اور سارے میں ڈھول تاشے بجنے لگے.... شہد کی مکھیاں پیغام لے کر آنے جانے لگیں۔ اور گل رُخ کی تھڑی تھڑی ہو گئی تب آمنہ ملکانی نے حکم دیا کہ بزنس مینوں کے گھر سے پارو بہو سے کوئی ملنے نہیں آ سکتا۔ اگر کوئی آیا تو واپس نہیں جا سکے گا۔ وہ جس دم سے پارو کو مارنے کا دل ہی دل میں عہد کر چکی تھی۔ وہ تو کبھی کا پارو کو ختم کر دیتی ــــ پر پوتے کی آس نے پارو بہو کی زندگی بچائے رکھی ــــ

اس رات جب چوری چھپے پارو کا ذہین خوبصورت بھائی کھڑکی ٹاپ کر اسے ملنے آیا تو وہ تڑپ گئی۔

"تم کیسے آئے ہو ماجد ــــ تمہیں یہاں کس نے آنے دیا۔ جانتے نہیں یہاں کے حالات کیسے ہیں؟ تمہیں کوئی مار دے گا بیوقوف"

"حویلی سے باہر کار کھڑی ہے ــــ درختوں میں سے چھپ کر آیا ہوں۔ چلو.... ابھی وقت ہے ابا نے بلایا ہے ــــ

پارو بہو نے خاموشی سے اٹیچی میں سامان رکھا۔ اس کے بھائی نے ابھی ایک جوتا جراب اتار کر پتلون کا ایک پائنچہ وضو کرنے کے لئے اُٹھایا تھا کہ دروازہ دھڑدھڑایا ــــ

پارو بہو نے دروازے کی جھری سے دیکھا اور پھر بھائی سے بولی ــــ "بھاگ جاؤ ــــ گل رُخ نشے میں ہے، تمہیں نہیں پہچانے گا مگر ملکانی کے کارندے

نہیں نہیں چھوڑیں گے۔ بھاگ جاؤ — ابھی اسی وقت۔"

ہوتے ہواتے، سمجھتے سمجھاتے، کھپتے کھپاتے، جلتے جلاتے، ملکانی نورافشاں آخر کو برآمدے میں رہنے لگی۔ جیسے دھوپ کبھی ادھر کبھی اُدھر برآمدے میں سائے چھوڑتی ہے، اسی طرح بڑی ملکانی کبھی اپنی کرسی ستون کے پاس، کبھی منی پلانٹ کے قریب اور کبھی قدآدم آئینوں سے بچ کر کھسکا لیتی لیکن رُخ اس کا ہمیشہ ملک آصف کے کمرے کی طرف رہتا۔ یادوں نے اس سے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ملک آصف کے والد کا چہرہ یاد کرنا چاہتی لیکن وہ اس کے ذہن کی سکرین پر نہ آتا۔ کمروں میں گئے لوگوں کی آوازیں اسے چونکا دیتیں۔ جوانی میں وہ چوروں سے ڈرتی تھی اب اسے موت سے خوف آتا تھا — وہ دنیا میں کسی چیز، واقعہ انسان کی منتظر نہ تھی پھر بھی آنے والی موت ہر حادثے، سانحے، بیماری، آفت، زلزلے سے مہیب تھی .....

وہ بہت باتیں یاد کرنا چاہتی تھی پر واقعات کا سرا ملنے سے پہلے اسے اونگھ آجاتی۔ وہ کئی چہروں کے نام یاد کرنا چاہتی اور کئی ناموں کے چہرے بھول گئی تھی۔

ساری زندگی کا سفر برآمدے میں ایک کرسی کے سفر سے زیادہ نہ تھا۔ کبھی یہاں سرکالی، کبھی وہاں اُٹھا کر رکھ دی۔ اگر کوئی اہم واقعہ تھا تو وہ ڈیکوریشن پیس کی طرح گم سم سجا تھا۔ نہ ہلتا تھا نہ بولتا تھا۔

جس روز سورج گرہن لگا اس روز دادی نورافشاں نے آسمان کی زرد روشنی دیکھ کر کئی بار لاحول پڑھی۔ ہر بار جب پارو بہو برآمدے میں آتی تو وہ کہتی — "قینچی سوئی کو ہاتھ نہ لگانا پارو بہو، کون جانے آنے والے پر کیا اثر ہو۔"

نہ جانے وہ کب کی بات تھی؟ — دادی نے سوچا جب ایک بھیانک چیخ کے ساتھ پارو بہو اپنے کمرے سے نکلی .... کچھ مزارع گل رُخ کو اُٹھائے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ پھر آمنہ ملکانی بغیر دوپٹے کے سینہ کوٹتی آئی۔ جس وقت مزارعوں نے سیاہ مرسڈیز میں سے نکال کر گل رُخ کی لاش کو ملکانی نورافشاں کے پاس تخت پوش پر ڈالا — اچانک سورج گرہن میں سے نکل گیا اور سارے میں سورج کی روشنی پھیل گئی۔

تخت پوش کے گرد آمنہ ملکانی، پارو بہو اور ملک آصف کھڑے تھے۔ دادی گل افشاں نے اپنے بدانتظام آصف کو دیکھا۔ وہ سوچنا چاہتی تھی کہ اس کے باپ کا چہرہ کیسا تھا لیکن اسے کچھ بھی یاد نہ آرہا تھا۔ پھر اس نے پوچھنا چاہا کہ گل رُخ اچانک کیسے رخصت ہوا؟

کیا اس نے خودکشی کی؟

کیا کسی دشمن نے مروا ڈالا؟

کیا کوئی حادثہ ہوا؟

لیکن پھر ملکانی نورافشاں نے پارو بہو کی طرح لب کاٹا اور آمنہ ملکانی کی طرح رونے لگی۔ ایک عرصہ ہوا اس نے سوال پوچھنا بند کر دیئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ سوالوں کا جواب کبھی نہیں ملتا — تسلی ملتی ہے، جھوٹ حاضر کئے جاتے ہیں لیکن سوال ادھورے رہتے ہیں — پھر دادی نورافشاں نے اپنی اتنی لمبی زندگی کو ایک سانس میں دیکھ کر سوچا۔

پوچھنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟ اس دارالفنا میں ہوتا ہواتا کچھ نہیں — بس آدمی پھیرا لگانے آتا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور اس آنے جانے کے درمیان ہنستے ہنساتے، روتے رُلاتے، چلتے چلاتے کچھ ایسے واقعات ہو جاتے ہیں

جن کا اصل مطلب کچھ نہیں ہوتا .... کسی کو سمجھ نہیں آتا۔ بھلا وہ انسان جو صرف آتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے، کچھ سمجھنے کی کوشش بھی کیوں کرے؟